بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانان ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں' حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانان ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان وسرگرداں' ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشان منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح وسلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار' بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت وانتشار اور یاس وحزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا' ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت وتدبر اور شفقت ومحبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد

یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفا شعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد، وہ مسلمانان ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنا لیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشان منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانان ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانان ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظّم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے

۱۹۳۰ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو، اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتاب زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلاب عظیم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیات ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلاشائبہء تشکیک، قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح، حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف، اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے، تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر، لباس مجاز میں سامنے آ جائے، وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؔ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں، اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا جزاء بما کانوا یکسبون (۹/۸۲)

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے، انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ

> ہندوستان میں، بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے، اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات و تصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم' اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے' ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دور ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؔ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

> لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر' اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس

کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سواس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔**ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ**(۳۱/۲۸)۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔بلوچی ہے یا سرحدی۔اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفوراً (القرآن:۷۶/۳)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

داعیانِ الی القرآن

حافظ سید محبّ الحق صاحب مرحوم!

’’ہم کہہ دیں گے کہ ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لے کر آئے ہیں‘‘

سفر آخرت کی تیاری ہو رہی ہے اور مسافر زادِ راہ تیار کر رہا ہے۔

خوش آں راہی کہ سامانے نہ گیرد

کے نشہ میں سرشار مسافر کی نگاہ میں دنیا کا کوئی سامان نہیں جچتا اور اس کی روح کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے:

حسبنا کتاب اللہ

وہ اپنے منتہا کو دیکھتا ہے‘ اسے یقین ہو چکا ہے کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ اس کی آنکھ اس جہان آب وگل پر بند ہو جائے گی اور اس عیشۃ راضیہ پر کھلے گی جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا نفس مطمئنہ اپنے آپ کو اپنے رب کے حضور میں محسوس کرتا ہے اور پورے یقین اور ایمان سے پکار اٹھتا ہے کہ

ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لے کر آئے ہیں!

ڈاکٹر تھارانی روڈ پر حسن منزل (کراچی) میں ایک مرد درویش رہا کرتے تھے۔ خوبصورت‘ نورانی چہرہ‘ سفید گھنی کھلی داڑھی‘ نوے سال سے اوپر کا سن عمر کے تقاضے سے جسم مجموعۂ امراض بن چکا تھا۔ بصارت قریباً جواب دے چکی تھی‘ سماعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جسمانی عوارض کے باوجود ذہنی مستعدی اور قلبی حضور کا یہ عالم تھا کہ جو ارادت کیش مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوتے ان کے مضطربانہ سوالات کے جواب میں نہایت اختصار سے یوں فرماتے کہ نیند بھی نہیں آئی‘ کچھ کھا بھی نہیں سکا‘ اختلاج بھی ہو گیا‘ وغیرہ‘ لیکن اللہ کا فضل ہے۔۔ اور اس کے بعد سلسلہ کلام کچھ اس طرح شروع ہو جاتا کہ دیکھئے‘ ہم بیٹھے بیٹھے قرآن کے فلاں مقام پر یوں غور کر رہے تھے۔ اگر اس میں کچھ اشکال محسوس ہوتا تو بلا تکلف سامع کی رائے پوچھتے ورنہ اپنے خیال کا اظہار کرتے اور اس انداز سے گفتگو جاری رہتی کہ پرسانِ حال یہ سمجھتے کہ آپ کے مزاج بحمداللہ بخیر ہیں۔

یہ تھے شمس العلماء حافظ سید محبّ الحق صاحب رئیس پٹنہ۔

☆☆☆

آپ شاہو بیگہ، ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش قریباً ۱۸۵۵ء تھا۔ چونکہ آپ کے والد بزرگوار سید فدا حسین صاحب اسی گاؤں میں مقیم تھے اس لئے آپ کے بچپن کا زمانہ اسی گاؤں میں گذرا۔ ایک قاری محمد جان صاحب کو انہیں قرآن مجید حفظ کرانے کے لئے مقرر کیا گیا۔ قاری صاحب لکھو کے رہنے والے تھے لیکن وہ تین سال تک ان کے پاس شاہو بیگہ میں رہے۔ قاری صاحب قرأت میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کے حسن قرأت کی وجہ سے مشہور تھا کہ ان کے پاس جن پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ جب سید صاحب کے پاس آتے تو آتے ہی کہتے: ہاں بھئی حافظ صاحب سناؤ! جب ان کا شاگرد انہیں بے تکلف قرآن سنا دیتا تو فرط محبت سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ تین سال کے بعد جب آپ لکھو واپس چلے گئے تو ایک نابینا حافظ فضل حسین صاحب حفظ قرآن پر مقرر کئے گئے۔ ان قاری صاحب کا حافظہ بلا کا تھا اور قرآن اس صحت اور روانی سے یاد تھا کہ جب بھی ان سے پوچھا جاتا کہ فلاں آیت کس مقام پر ہے تو نہایت بے تکلفی سے فوراً صحیح بتا دیا کرتے تھے۔

جب حافظ صاحب کی عمر کوئی ۲۳ یا ۲۴ برس کی ہوئی تو آپ عظیم آباد (پٹنہ) تشریف لے گئے۔ وہاں پر آپ نے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں ایک بڑے رئیس مولوی مشیر علی صاحب کی نواسی۔۔ سے آپ کی شادی بھی ہوگئی تو آپ نے پٹنہ ہی میں مکان بنوا کر مستقل رہائش اختیار کر لی۔ تین چار سال میں ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ بھی فوت ہوگئی آپ کے چچا سسر کا نام سید رضا حسین تھا جو وہاں کے ''سرسید'' مشہور تھے۔

آپ کی دوسری شادی سید عبدالعزیز کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ سید عبدالعزیز صاحب پٹنہ کے مشہور لیڈر تھے اور مخدوم راسنیؒ کی اولاد میں سے تھے۔

اب حافظ صاحب کا رجحان تصوف کی طرف ہونا شروع ہوگیا۔ آپ کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی کہ ایک بزرگ حاجی خدا بخش صاحب جو کہ غازی پور کے رہنے والے تھے اور دہلی میں مقیم تھے، پٹنہ تشریف لائے۔ ایک دن اتفاقیہ حافظ صاحب کی ان سے ملاقات ہوگئی تو آپ نے دیکھا کہ لوگ آ آ کر حاجی صاحب سے قرآن کے مطالب پوچھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے بھی عرض کیا کہ اگر آپ خدا کی راہ بتاتے ہیں تو میں بھی آپ کے پاس آیا ہوں۔ حاجی صاحب نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ قرآن میں ہے اور ''تمہارے پاس قرآن موجود ہے''۔ حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جب بھی ان سے کچھ پوچھا جاتا تو حاجی صاحب یہی جواب دیتے کہ تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔''

حافظ صاحب پہلے ہی سے قرآن کی طرف راغب تھے۔ حاجی صاحب کے جواب سے ان کے رجحان کو اور تقویت ملی۔ آپ کے بیان کے مطابق ان کے پیر صاحب بیعت نہیں لیا کرتے تھے بلکہ صرف قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس سے ان کا قرآن میں استغراق اس قدر زیادہ ہوگیا کہ بتدریج کسی اور کتاب

کی طرف توجہ ہی نہ رہی' نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب ۱۹۴۰ء میں محترم پرویز صاحب نے ان کی طرف خط لکھا اور ایک حوالہ دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا:

''میں نے اپنی کل کتابیں حدیث وتفسیر سب ہی مدرسہ شمس الہدیٰ میں دے ڈالی تھیں اور صرف قرآن کو اپنا نصب العین بنایا تھا کہ بس قرآن ہی کافی ہے..... میری کل تصنیفوں کی بنیاد صرف قرآن پر ہے..... میرا سن انہتر کو پہنچا۔ اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں رہا۔ کتابیں قرآن کے سوا کوئی میرے پاس نہیں۔ (۲۱ اگست ۱۹۴۰ء)

☆☆☆

آپ کی سب سے اولیں تصنیف ایک رسالہ ''میلاد النبی'' ہے۔ یہ ۹۲ صفحات کا رسالہ بہت مقبول ہوا اور کئی بار شائع ہوا۔ گو بعد میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ میرے ایام جاہلیت کی تصنیف ہے'' تاہم اس کی بہت قدر کی گئی۔ یہ رسالہ حیدرآباد (دکن) میں بھی شائع ہوا تھا۔ پٹنہ کے ایک پادری ڈین صاحب نے' جن کے ذمہ ڈسٹرکٹ سکولوں کے لئے نصاب تعلیم کی کتابوں کا انتخاب تھا' دیکھ کر کہا:

ہم نے پیغمبر اسلام کے حالات بہت پڑھے لیکن اس جیسی کتاب نہیں دیکھی۔

سر علی امام پٹنہ کے مشہور بیرسٹر حافظ صاحب کے بھانجے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آپ کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ دوران گفتگو کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں بے تکلف ہو کر آپ سے گفتگو کروں کیونکہ میں بعض سوالات کے تشفی بخش جواب چاہتا ہوں۔ آپ کے اجازت دینے پر سر علی امام کہنے لگے کہ قرآن مجید کی حقانیت کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کہ اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ سعدی کی گلستاں اور ہومر کی کتاب اور اسی طرح کی کئی کتابیں ہیں کہ ان کے جواب کی کتابیں بھی آج تک کوئی شائع نہیں کر سکا۔ اور پھر قرآن میں کوئی تسلسل بھی نہیں۔ کہیں کچھ ہے' کہیں کچھ۔ حافظ صاحب نے اعتراض سنا اور بڑے تحمل سے جواب شروع کیا:

جیسا کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق میں سلسلہ ہے' ویسے ہی اس کے کلام میں سلسلہ ہے' جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے.....

حافظ صاحب نے ان اعتراضات کو سامنے رکھا اور ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پہلی کتاب ''دعوت الحق'' تصنیف کی۔ آپ نے جب یہ کتاب سر علی امام کو دکھائی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کے سب اعتراضات کا جواب مل گیا ہے۔ اس اثنا میں آپ مسوری تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کے پاس کالج کے دو متعلم آنے لگے۔ ان کا میلان دہریت کی طرف تھا۔ دوران گفتگو میں وہ اعتراضات کرتے اور حافظ صاحب ان کے جواب دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ ایک دن آپ نے ان سے کہا کہ اس طرح تو تمہارے سوالات ختم نہیں ہوں گے' لو یہ کتاب میں نے لکھی ہے' اسے پڑھو۔ انہوں نے بھی جب دعوت الحق کا مطالعہ کیا تو اس میں اپنے جملہ اعتراضات کا تشفی بخش جواب

پایا اور دہریت سے باز آ گئے۔ اس کے بعد ''دعوت الحق'' کو شائع کر دیا گیا اور وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی نظام دکن نے بھی بہت تعریف کی اور حافظ صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ حافظ صاحب کے نظام دکن سے قریبی مراسم تھے' چنانچہ جب ملاقات ہوتی تھی تو متعدد مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ آپ جب بھی حیدر آباد جاتے ایک ایک دو دو ماہ قیام رہتا۔

حافظ صاحب کی تمام تصانیف اس وقت قریباً نایاب ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ دعوت الحق ہمارے بھی پیش نظر نہیں۔

دعوت الحق کے کوئی دس برس بعد ۱۳۳۹ھ میں یعنی آج سے کوئی اسی اکیاسی برس پہلے شرعتہ الحق شائع ہوئی۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب منہاج الحق تھی جو کوئی چھ سال بعد یعنی ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔ حافظ صاحب پرویز صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:

> میں نے کتاب (یعنی شرعتہ الحق) لکھی' اس کو قریب قریب چالیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ کتاب جو علماء کے لئے ہے اور دوسری کتاب منہاج الحق جو صوفیہ کے لئے ہے۔ دونوں کتابیں دس برسوں تک لکھی لکھائی پڑی رہیں۔ میرا لڑکا بیرسٹری کے لئے ولایت گیا ہوا تھا' چھپوانے کا موقع نہ ملا اور پھر بھول چوک بھی۔ اتفاق سے میں حیدر آباد گیا۔ وہاں منہاج الحق سننے کو مجمع آتا رہا اور اس میں ہمارے دوست مولوی حمید الدین صاحب بھی آئے۔ فرمائش کر کے کچھ سنا اور کتاب کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ دیکھا تو ان کی نظر پڑی کہ اس کتاب کو صاف ہوئے دس برس ہو گئے۔ وہ مصر ہوئے کہ اس کو فوراً چھپنا چاہئے' ورنہ آپ مر جائیں گے اور کتاب ضائع ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے بہت ذخیرے ضائع ہو چکے۔ انہوں نے اسی وقت کاتب کو بلا کے اس کے حوالہ کیا کہ فوراً کتاب چھپے۔ میں نے کہا کہ پروف کون دیکھے گا میں جا رہا ہوں۔ مولوی عبدالغنی مرحوم نے کہا کہ میں دیکھوں گا غرض احباب کی زبردستی سے وہ کتاب چھپی۔
> (۱۴ اگست ۱۹۴۰ء)

مولانا حمیدالدین فراہی صاحب نے نہ محض مسودہ کاتب کو دلوایا بلکہ اپنی گرہ سے پچاس روپے بھی دیئے تاکہ کتاب کے چھپنے میں مزید رکاوٹ نہ ہو۔

محولہ بالا خط سے پتہ چلتا ہے کہ شرعتہ الحق اور منہاج الحق چالیس سال پہلے یعنی قریباً ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ضبط تحریر میں آئی تھیں۔ انیسویں صدی کا ورق الٹا جا رہا تھا۔ تاریخ کے اس نہ بھولنے والے ورق کی تحریر کا بیشتر حصہ خون مسلم کی سرخ روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ اس صدی کے آخری حصہ نے ممالک اسلامیہ کو سکرات الموت تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرکز' نام نہاد مغلیہ سلطنت کی شکل میں جیسا کیسا باقی رہ گیا تھا وہ مٹ چکا تھا۔ عالم اسلامی کا مرکز خلافت عثمانیہ تھی' وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔ اسے نیست و نابود کرنے کا فریضہ انیسوی صدی نے بیسویں صدی

کے سپرد کیا۔ بیسویں صدی نے اس سرعت اور مستعدی سے اس سے سبکدوشی حاصل کی کہ اسے انیسویں کا ہی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ان پیہم صدمات سے مسلمانان عالم پر ہمہ گیر اضمحلال چھا گیا تھا۔ سیاسی شکستوں کے جلو میں ان کے علمی مراکز ختم ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس نہ حکومت تھی' نہ دولت' نہ علم۔ شکم خالی' قلب مردہ' دماغ تاریک' حال پریشاں' مستقبل پریشان تر۔ عالم اسلامی پر عمومی جمود تھا۔ کیا اس سین پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پردہ گر جائے گا؟ یا تاریخ ملت ابھی سنبھالا لے گی؟ یہ سنبھالا امر محال نظر آتا تھا۔ مسلمان سیاسی شکست سے ہی ہم کنار نہیں ہوئے تھے' وہ روح زماں کی رفاقت سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ان قوئ سے ہم آہنگ نہ کر سکے تھے جنہیں انیسویں صدی نے جنم دیا تھا۔ یہ صدی سائنسی ایجادات کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے قوائے فطرت کو مسخر کرنے کا راز دریافت کیا اور آثار پیدا ہوئے کہ ہر چند کائنات لامتناہی ہے اور علیٰ قدر تناسب انسان ذرہ ناچیز ہے' لیکن وہ رموز فطرت کی عقدہ کشائی کر کے ایک زندہ فعال اور ہدایت کار عامل بن سکتا ہے۔ انسان کا شعور خودی بیدار ہو رہا تھا۔ اس انقلاب عظیم میں انسانوں کے وہ گروہ جو بدستور ماضی میں رہ رہے تھے ماضی ہی کی آغوش میں رہ گئے۔

ہر چند ان زلزلوں سے کوہ و دشت سحاب کی مانند اڑتے دکھائی دے رہے تھے' لیکن تہ سے کچھ تازہ چشمے بھی ابلتے نظر آ رہے تھے۔ ہندوستان میں سرسید للکارا کہ یہ شکست و ریخت تعمیر نو کی نوید ہے۔ انیسویں صدی کی قوت تعمیر کا یہ پیکر تخریب و تعمیر کے دیرینہ روابط کا اندازہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ضرورت نئی زمانی قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی تھی۔ لیکن نظر بہ ظاہر ان نئی قوتوں نے تو مسلمانوں کو پامال کیا تھا وہ اس سے کیسے ہم آہنگی کر سکتے تھے؟ نہیں' یہ ہم آہنگی ان اصول و قوانین سے ہونی تھی' تخریبی قوتیں جن کا ہنگامی مظہر تھیں۔ سرسید ایک ہی سہارا لے سکتا تھا اور اس کا وجدان اسے وہیں لے گیا۔ اس نے گرد آلود غلاف سے قرآن کو نکالا اور اس کا ایک ایک صفحہ کھول کر مسلمانوں کو دکھایا اور انہیں بتایا کہ اس کے ایک ایک لفظ میں زندگی کے کس قدر راز پوشیدہ ہیں۔ قرآن صدیوں سے مسلمانوں کے پاس تھا اور ہر وقت ان کے پاس رہا۔ کیا وہ واقعی انقلاب انگیز کتاب تھی؟ کیا وہ حیات انسانی کے اس اہم موڑ پر واقعی راہنمائی کر سکنے کی اہلیت رکھتی تھی؟ بے دین یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب شوکت کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہنے والا مسلمان یہ کیسے یقین کر سکتا تھا؟

مسلمان صدیوں سے قرآن کو پس پشت ڈال چکے تھے۔ اب وہ بظاہر قرآن کا نام لیتے تھے اور درحقیقت احادیث و روایات مراد لیتے تھے۔ روایات نہ محض اساس دین بن چکی تھیں بلکہ وہ قرآن پر قاضی اور اس کی ناسخ قرار پا چکی تھیں۔ یہ عقیدہ اس قدر راسخ اور یہ ذہنیت اس قدر متشدد ہو چکی تھی کہ کسی کے ذہن میں خیال تک نہیں آ سکتا تھا کہ دین کی اساس تنہا قرآن پر رکھی جا سکتی ہے۔ مسلمان نہ محض ماضی ہی کو روایات کی عینک سے دیکھتے تھے بلکہ حال و

مستقبل کو بھی اسی میزان میں تولتے تھے۔ ان کے لئے سب کچھ مقدر ہو چکا تھا جس پر ''شکر'' اور ''صبر'' کرنا چاہئے۔ فکر سے عاری اور عمل سے بیگانہ ہو کر قومیں مات کھا جاتی ہیں اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا جس میں کبھی بنی اسرائیل رہ چکے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایاماً معدودہ۔ یہ زندگی چند روزہ ہے' دوسری حیات جاوید دائمی جنت میں گزرے گی۔ انہیں جھنجھوڑنے اور حقائق زندگی سے متعارف کرانے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں قرآن کی طرف دعوت دی جاتی' لیکن قرآن روایات کی بے شمار تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کیا ان 'مقدس' تہوں کا تار و پود بکھر سکتا تھا؟ موج حیات بڑھ کر جب جوئے تند و تیز ہونے پر آئی تو پھر اس کی روانی اور جولانی کو کون روک سکتا تھا!

حافظ محبّ الحق اسی جذب اندروں کے مظہر تھے۔ آپ روایات کی پر پیچ و تار راہوں سے گزرتے ہوئے قرآن کے چشمۂ حیواں تک پہنچے اور دل کھول کر مسلمان کی تشنگی کا سامان بہم پہنچایا۔ آپ شرعۃ الحق کے ذیلی عنوان میں لکھتے ہیں:

> جس میں شریعت حقہ صرف قرآن مجید کی صریح آیتوں سے بیان کی گئی ہے اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ قرآن مجید مکمل اور مفصل ہے اور یہ بھی کہ خدائی کتاب انسانی رائے کی پابند و ماتحت نہیں ہے اور یہ بکمالہ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کا مظہر کامل ہے۔

غرض تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان دونوں کتابوں (شرعۃ الحق اور منہاج الحق) کا مخرج قرآن مجید ہے..... مجھے قرآن مجید ہی سے سمجھانا ہے اور میں سمجھاؤں گا..... میں جانتا ہوں کہ قوم حق بینی کی نگاہ نہ ڈالے گی..... وہ قرآن مجید کے مقابلہ میں بھی اپنی آبائی روش کی جاندادہ ہو کر کہ ماالفینا علیہ اباء نا مجھے برا بھلا کہے گی' اُمی محض کہے گی' تو کچھ بے جا اور برا نہ کہے گی.....اس کا یہ کہنا صحیح ہوگا' مگر اس کا یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ ایک جاہل اور امی نور حق کا مورد اور حق گو نہیں ہو سکا۔ مجھے جو کچھ بھی وہ کہے حق ہو سکتا ہے' مگر اس کا حق سے منہ موڑنا کبھی حق نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مجھے دیکھے گی تو ٹھوکریں کھائے گی اور اگر وہ حق کے آگے سر جھکائے گی تو نجات پائے گی۔

اس کتاب میں کئی مباحث ہیں۔ چند عنوانات سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) خداوند عالم نے سارے رسولوں کے ذریعہ ایک ہی صراط مستقیم کی ہدایت کی۔

(۲) کیا ہر دین ماسبق دین کا ناسخ ہے یا مصدق؟

(۳) کیا قرآن کی آیات ایک دوسرے کی ناسخ ہیں؟

(۴) دین الٰہی میں حکم خداوندی واجب التعمیل ہے یا کسی اور کا بھی؟

(۵) اگر اطاعت قرآن مجید کی فرض ہے تو اطاعت

رسولؐ کے کیا معنی؟

(۶) قرآن مجمل ہے یا مفصل، کامل ہے یا ناقص؟ محتاج تفسیر ہے یا نہیں؟

(۷) قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ کی باہمی منزلتیں۔

اطاعت رسول کے معنی بیان کرتے ہوئے آپ اس عام عقیدہ کو زیر بحث لاتے ہیں کہ حدیث جزو دین ہے اور لکھتے ہیں:

> اگر اطیعوا الرسول کے یہ معنی ہوں تو خود آنحضرت صلعم پر، جو ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفیق تھے، اپنے کل اقوال و افعال کو قرآن مجید کی طرح لکھوا جانا اور بذریعہ حفاظ اشاعت کرنا لازم ہو جائے گا تاکہ آپ کی امت اطیعوا الرسول کی نافرمان نہ ہو سکے۔ اگر قرطاس اسی لئے طلب فرماتے ہوں اور لکھوا نہ سکے، تو صحابہؓ، خلفاءؓ، اہل بیت اور کل مخلصین مسلمانوں کو فتوحات سے بڑھ کر ضروری اور لازم تھا کہ آپ کے اقوال و افعال کو جمع کر لیں اور آپ کے حرکات و سکنات کو قلم بند کر لیں..... تاکہ خود بھی اور سارے مسلمان بھی اطیعوا الرسول کے نافرمان نہ بن سکیں۔ مگر کسی نے جمع نہ کیا۔ اگر اطیعوا الرسول کے یہی معنی ہیں تو اس کا کوئی مطیع نہیں ملے گا کیونکہ آپ کی مقدس زندگی کے سارے اقوال و افعال اور حرکات و سکنات نہ پہلے کسی کو پہنچے ہوئے تھے اور نہ اب پہنچے ہوئے ہیں۔ تو پھر اطاعت رسول کس نے کی اور کون کر سکتا ہے؟ اگر اطاعت رسول کے یہ معنی ہوتے جو لوگ سمجھتے ہیں تو صحابہؓ اس سوال میں بے باک نہ ہوتے کہ یا رسولؐ اللہ یہ حکم آپ کا ہے یا خدا کا۔ اور ایسے حال میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کبھی زینبؓ کو طلاق نہ دیتے درآنحالیکہ نبی فرما رہے تھے امسک علیک زوجک۔ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔

لہٰذا

> اطاعت سے مراد رسالت یعنی قرآن کے ہیں۔ یہی اطاعت خدا کے بھیجے ہوئے اور رسولؐ کے لائے ہوئے قرآن کی ہے، اور یہی ایک اطاعت دونوں کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

حافظ صاحب کی علمی تحقیقات اور تصنیفی مساعی کا نکتہ ماسکہ قرآن تھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ اپنی فہم کے مطابق قرآن ہی سے اخذ کیا۔ وہ اس مقصد کا اتنا قوی احساس رکھتے ہیں کہ قدم قدم پر قارئین کو یاد دلاتے ہیں۔ وہ قرآن میں کسی قسم کی آمیزش کے روادار نہیں۔ چنانچہ ایک بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

> چونکہ یہ میری تحقیق ہے، یعنی ایک انسانی تحقیق ہے جس میں غلطی ہو سکتی ہے، تو اس کی تحقیق مصطلحات سے، محاورات عرب سے، مذہبی تاریخ یعنی حدیث سے، یا اعمال قوم سے جس طرح چاہو کر سکتے ہو۔ مگر وہ ماخذ اسناد کی جگہ ہماری جہالت اور لاعلمی دور کرنے والے ہو سکتے ہیں، داخل دین ہو کر دین اللہ

نہیں ہو سکتے' نہ قرآن مجید کی قطعیت چھین سکتے ہیں.....اگر میری تحقیق سے اتفاق نہ ہو تو آپ تحقیق کرو.....تحقیق کو میں منع نہیں کرتا.....مگر خدا کے لئے قرآن کو مجمل نہ کہو کہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔

کتاب کے خاتمہ پر مختصر سی مناجات ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے معافی اور بخشش طلب کرنے کے بعد اپنے متعلق کہتے ہیں:

اے خدا! میری ازلی تمنا ہے کہ پرسش اعمال کے دن ہمارا نامۂ اعمال قرآن مجید ہی نکلے' اس کی شریعت کامل بھی اور اس کی روحانیت اتم بھی۔ اپنی بساط سے باہر آرزو لے کر آیا ہوں' لیکن اے خدا' مجھے نہ دیکھ' اپنے کو دیکھ۔ تو وہ کر جو تیری خدائی کے شایاں ہو' اور تیری عظمت وجلالت کے سزاوار..... تاکہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد میں میرا نام نہ ہو جس وقت خود بدولت کی یہ فریاد ہو گی:

وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔

قرآن کی طرف یہ بے باک دعوت اور قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کا یوں صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک تعین مذہبی حلقوں میں تہلکہ مچا دینے کے لئے کافی تھا۔ حیدر آباد (دکن) کے 'مذہبی' امور کے افسر اعلیٰ ان دنوں حبیب الرحمٰن شیروانی تھے۔ انہوں نے اس کتاب کو گمراہی پھیلانے والی کتاب قرار دیا اور حیدر آباد سے حافظ صاحب کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ بند کرا دیا۔ نیز انہوں نے کسی مولوی صاحب سے کچھ اعتراضات لکھوائے اور حافظ صاحب کی طرف بھجوائے کہ وہ ان کا جواب دیں۔ حافظ صاحب نے انہیں لکھا کہ:

آپ ایک جلسہ قائم کر کے علماء کو بلا لیں تو میں ان سے اس پر بحث کرنے کے لئے تیار ہوں مگر اسی شرط پر کہ قرآن سے اعراض نہ ہو۔

کون مولوی اس شرط کو منظور کر سکتا تھا! خیر' نظام نے حافظ صاحب کا موقوف شدہ وظیفہ از سر نو جاری کر دیا۔

خود حافظ صاحب نے اس مخالفت کی طرف اس انداز سے اشارہ کیا ہے جو متانت اور لطافت کا حسین امتزاج ہے۔ اپنی آخری کتاب ''بلاغ الحق'' میں ''عرض حال'' کے تحت لکھتے ہیں:

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاخسانے کھڑے کئے جائیں' وہ کھڑے کئے گئے۔ کسی کسی نے الٹ پلٹ کر کچھ دیکھا بھی تو بری نگاہ سے۔ کسی نے کہا کہ یہ اہل قرآن ہو گئے' قرآن ہی سے لکھتے ہیں' حدیث سے نہیں' اقوال علماء سے نہیں' تو ان کے کفر میں کیا کلام رہا۔ کسی نے کہا کہ منہاج الحق میں رقص مستانہ اور رسوم خانوادہ کی حمایت نہیں ملتی تو ان کے منکر خانقاہ اور کافر ہونے میں کونسی تامل کی جگہ باقی رہی.....کسی نے کہا کہ جس گھر میں یہ کتاب رہے وہ کافر کا گھر ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے پڑھی بھی' فرمانے لگے پڑھی تو نہیں' اور پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ کہنے والوں نے کہا' سننے والوں نے سنا۔

جو میں نے سنا وہ اک معتبر حضرت سے سنا ہے جو میرے عقیدہ میں ثقہ ہے۔

روایت پرستوں کے نزدیک کسی روایت کی صحت کا دارومدار مفروضہ راوی کی مزعومہ ثقاہت پر ہے۔ ثقاہت کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ چنانچہ حافظ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

جیسے کسی کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ ملاقات میں ان کے دوست نے پوچھا کہ بھئی میں نے تمہارے مرنے کی خبر سنی' سخت صدمہ ہوا۔ وہ فرمانے لگے کہ بالکل غلط ہے' دیکھ لو میں مجسم موجود ہوں۔ ان کے دوست نے کہا کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا اور وہ آپ سے زیادہ ثقہ ہیں۔

اب ایک ''ثقہ'' مولوی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں متعلقہ شخص کا مجسم موجود ہونا اس بات کا کیسے ثبوت ہوسکتا ہے کہ مولوی صاحب کی روایت غلط ہے اور وہ مرنہیں گیا؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ شخص جو اپنے مرنے کی خبر کی خود تردید کر رہا ہے کذاب ہے!

''بلاغ الحق'' حافظ صاحب کی آخری کتاب ہے۔ کتاب میں کہیں سن اشاعت نہیں دیا گیا۔ اس کتاب میں حدیث کی ظنیت کے مقابلہ میں قرآن کی قطعیت ثابت کی گئی ہے اور عبادات اور معاملات پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان کے دلائل میں پختگی آ گئی ہے اور ان کا قرآن کی قطعیت پر ایمان مستحکم تر اور متشدد تر ہو گیا ہے۔ لیکن آپ کے انداز تحریر میں اس قدر توازن ہے کہ باوجود شدت تاثر کہیں جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوتے۔ مخالفین کی ایک ایک دلیل کو قرآن ۔۔ اور خود حدیث ۔۔ سے رد کرتے ہیں اور کسی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ وہ مخالفین کی مخالفت سے بالکل برہم نہیں ہوتے اور بدلائل ان کا جواب دیتے ہیں۔ اپنے متعلق انکا ہمیشہ یہی دعویٰ ہے کہ میں نے قرآن اور صرف قرآن پیش کیا ہے۔ قارئین کو مصنف سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن قرآن سے تو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا وہ ہر ایک کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ مجھ پر نکتہ چینی کرو' میری عیب جوئی کرو' لیکن قرآن کو نہ ٹھکراؤ۔ خود اس میں تفکر اور تدبر سے کام لو اور مجھے نظر انداز کر دو۔

☆☆☆

حافظ صاحب کی صحت بہ تقاضائے عمر برسوں سے خراب چلی آ رہی تھی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کے تحریر کردہ خط میں آپ نے پرویز صاحب کو لکھا:

اس ناسازیٔ طبع نے یہ سمجھا دیا کہ اب تصنیف یا تحریر کا وقت گذر گیا۔ کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر ضعف سے سر میں چکر' ایسے حال میں کیا لکھوں۔ بیاسی برس کا سن ہوا' قویٰ جواب دے رہے ہیں۔ دوا کیا کام کرے گی۔ سوکھے درخت میں پانی ڈالنے سے کچھ نہیں ہو گا غالب خوب کہہ گیا ہے۔

دم واپسیں برسرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس کے باوجود آپ نے طلوع اسلام کی طرف ایک تحریر بھیجی جسے آپ نے بخار اور بخار کے ضعف کے باوجود لکھا لیکن آپ میں نظر ثانی کی ہمت نہ تھی۔ اس سے پیشتر ایک خط میں

جو ۲۱ اگست ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے' آپ نے اپنی جسمانی کیفیت کو مجملاً بیان کیا اور اپنے آپ کو ''مردہ نما زندہ'' کہا لیکن اندرونی کیفیت اس پر بھی یہ تھی کہ:

ہمت کہتی ہے کہ چل' پیری کہتی ہے کہ اب وہ دن گئے' پیچھے نہ دیکھ' آگے دیکھ۔

ان کی ہمت پیری سے برسر پیکار رہی اور آخر دم تک ان کا ساتھ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور وفات تک یہیں کراچی میں مقیم رہے اور بالآخر یہیں مدفون ہوئے۔ ان کے معتقدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گفتگو ہمیشہ قرآن ہی سے متعلق ہوتی۔ آپ نے جب پرویز صاحب سے سنا کہ معارف القرآن (جلد چہارم) کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ اب میں اللہ میاں کے ہاں سے Extension (عمر میں توسیع) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لوں' وہ منظور ہو گئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گذارش کیا ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیل طباعت میں جلدی کرو۔ میری بینائی کا تھوڑا سا حصہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے اس کتاب کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ اللہ نے ان کی یہ درخواست بھی منظور کر لی اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام معراج انسانیت کا ایک ایک لفظ پڑھنے میں صرف فرمائے۔

۱۹۴۱ء میں جب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور پرویز صاحب نے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا تو آپ نے رسید کے خط میں تحریر فرمایا:

جہاں تک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے' آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحاد خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور لا تزکوا انفسکم کے احاطہ کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء)

کراچی میں پرویز صاحب اور ادارہ طلوع اسلام کے اراکین سے ملاقات میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی ہے تو ہمیشہ یہ خیال دامن گیر رہا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ آواز یہیں ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سن لی میری زندگی ہی میں یہ دعوت عام بھی ہوئی اور (پرویز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرا کر فرمایا) اب اس کی بھی تسلی ہو گئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

گذشتہ صدی کے آخر میں جب اس مرد مومن نے رجعت الی القرآن کی دعوت دی ہو گی تو اس وقت یہ دعوت کس قدر غیر مانوس اور ناآشنائے گوش ثابت ہوئی ہو گی' اور آج اس مرد مومن کی مسرتوں کا کیا ٹھکانہ ہو گا جس نے اپنی دعوت کو اپنی زندگی میں یوں عام دیکھ لیا۔ کتنی کامیاب ہے زندگی اور کتنی قابل رشک ہے یہ موت!

حافظ صاحب کی صحت برسوں سے خراب تھی۔ کراچی میں ان کی حالت اور خراب ہوگئی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس کے باوجود ۱۹ جون ۱۹۴۹ء کی صبح کو آپ یک لخت پرویز صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ بقول پرویز صاحب ان کا ''ظلمت کدہ قرآن کے نور سے وادی ایمن بن گیا۔'' پرویز صاحب نے جب اس زحمت کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ مجھے اطلاع دی ہوتی تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ تو اس پر آپ نے فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادم قرآن کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہوگئی۔

یہ کیفیت اسی مرد مومن کی ہوسکتی ہے جس کی عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ میں گزری ہو اور اس کی زندہ تفسیر کہ قل ان صلاتی و نسکی و محیای ومماتی للہ رب العالمین۔

طلوع اسلام میں ''اسباب زوال امت'' سے متعلق سلسلہ گفتگو کا آغاز ہوا تو موضوع کی اہمیت کے پیش نظر حافظ صاحب نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اپنے گراں قدر خیالات پیش کئے۔ ان کا مضمون اگست ۱۹۴۹ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ آپ نے وہ مضمون' اسطرح تحریر فرمایا کہ ضعف بصارت کے باعث اپنے لکھے کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ کاغذ اور قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا اور بلا دیکھے اپنے خیالات تحریر فرماتے چلے گئے۔

☆☆☆

مسلسل عوارض اور تقسیم ہند کے ضمنی عواقب کی وجہ سے حافظ صاحب مغفور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شروع مئی ۱۹۵۰ء میں وہ لاہور تشریف لے جانے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ ان سے جب لاہور کا ذکر آتا تو فرماتے کہ وہاں عرشی صاحب کی قرآنی جماعت ہے' ان سے قرآن پر باتیں ہوا کریں گی۔ ۲۷ مئی کو روانگی کا خیال تھا اور تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ چنانچہ ۲۵۔۲۶ مئی ۱۹۵۰ء کی درمیانی شب کو رحلت فرما گئے۔ فھو فی عیشۃ الراضیہ۔

☆☆☆

حافظ صاحب کے استغراق فی القرآن کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے یا وہ خوش نصیب جنہیں ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے۔ ہر چند حافظ صاحب کی عمر انیسویں اور بیسویں دونوں صدیوں پر برابر کی تقسیم ہوگئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے انہوں نے بیسویں صدی کو کہیں زیادہ دیکھا کیونکہ ذہنی پختگی کا زیادہ حصہ اسی صدی میں گذرا لیکن وہ درحقیقت انیسویں صدی ہی کے مظہر اور نمائندہ تھے۔ انیسویں صدی میں حافظ صاحب ہراول تھے اس عظیم تحریک (رجعت الی القرآن) کے جو بیسویں صدی میں مسلمانوں کے فکری انقلاب کا باعث بنی۔

ہمیں افسوس ہے کہ حافظ صاحب کے حالات

زندگی زیادہ تفصیل سے مہیا نہیں کئے جا سکے۔ اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔ آخری ایام میں ملک غلام کبریا صاحب (امت مسلمہ والے) ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چیدہ چیدہ واقعات زندگی لکھوانے کے لئے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قصۂ پارینہ ہے۔ ایک گنہگار انسان ہوں اور ابھی تک جیتا ہوں' اور تمہارے سامنے ہوں' دیکھ لو۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ حافظ صاحب نے اس قصہ پارینہ کی کڑیاں قصداً گم کیں۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے اپنے صاحبزادوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ میرے جو خطوط تمہارے پاس ہیں وہ لے آئیو۔ جب سب خطوط ان کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے تو آپ نے ایک ایک کر کے ان کو تلف کر دیا۔ ان خطوط سے ان کے متعلق بیش قیمت معلومات مل سکتی تھیں لیکن انہوں نے ان کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ یہ چند واقعات جو پیش کئے گئے بہت حد تک ملک غلام کبریا صاحب نے جمع کئے۔

☆☆☆

سطور بالا سے شمس العلماء سید حافظ محبّ الحق صاحب کی عظمت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دور میں اصحاب علم کو کون پوچھتا ہے؟ ملت کو ان کی احتیاج نہیں! یہ چند سطور لکھ کر حافظ صاحب کا ذکر اسلئے کر دیا گیا ہے کہ آئندہ نسلیں اگر زندگی کی اساس قرآن کو بنائیں تو وہ داعیان الی القرآن کے مبارک سلسلہ کی مختلف کڑیوں سے ناواقف نہ ہوں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُغتنمات

(بہ سلسلۂ اسباب زوال امت)

(شمس العُلماء حافظ سید محبّ الحق صاحب مدظلہٗ العالی)

مخدوم ومکرم جناب حافظ صاحب قبلہ کا تذکرۂ گرامی، محترم پرویز صاحب کی وساطت سے، طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں زینت دہِ اوراق ہو چکا ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے تحریر فرمایا تھا، قبلہ حافظ صاحب کی عمر قریب سو سال کی ہوگی۔ بینائی کا یہ عالم ہے کہ بمشکل حروف پڑھ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ ''اسباب زوال امت'' کے سوال کی اہمیت کے پیش نظر قبلہ حافظ صاحب نے اپنے خیالات اس طرح زیب قرطاس فرمائے ہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے تھے، اسے خود پڑھ نہیں سکتے تھے۔ یعنی بلا دیکھے اپنے خیالات تحریر فرماتے چلے گئے۔ اب یہ تحریر آپ نے طلوع اسلام کو بغرض اشاعت مرحمت فرمائی ہے۔ جس پر طلوع اسلام جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ طلوع اسلام کی خوش بختی ہے کہ جناب حافظ صاحب کی سابقہ تحریریں ۱۹۴۰-۴۱ء میں بھی یہیں شائع ہوئیں اور ان کے بعد اب یہ تحریر بھی اسی کے حصہ میں آئی۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

(طلوع اسلام)

سوال یہ ہے کہ جب مسلمان حق پر ہیں تو ایسے برے حال میں کیوں ہیں؟ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر۔ یہاں تک کہ ہندوؤں سے بھی ہر چیز میں کہیں فروتر۔

(قبلہ حافظ صاحب کی کتاب دعوت الحق میں ایک طالب آپ سے سوالات پوچھتا ہے اور آپ اس کے جوابات دیتے ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت سے متاثر ہونے کے بعد مندرجہ بالا سوال پوچھتا ہے۔ یعنی حافظ صاحب، طلوع اسلام میں شائع شدہ سوال کو اسی طالب کے سوال کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں۔ طلوع اسلام)

ہاں یہ اعتراض صحیح ہے، اس کا جواب ذرا توجہ سے سنئے۔

خدا نے بندوں کا برا حال دیکھ کر پیغمبروں کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ خدا کا پیغام لائے یعنی کتاب اللہ لائے۔ اسے قوم کو دیا۔ اور اس پر خود عمل کر کے انہیں بتایا۔ قوم نے ترقی کی۔ مختلف اقوام میں سے ہر ایک قوم کو اصول کے اعتبار سے ایک ہی کتاب مختلف زبانوں میں ملتی رہی تھی۔ ہر کتاب ایک دوسرے کی مصدق۔ کیونکہ ہر ایک کتاب قانون فطرت کے مطابق تھی۔

خدا کی شان سے یہ بہت بعید تھا کہ فطرت تو کچھ اور بناتا اور حکم کچھ اور دیتا۔ سب پیغمبروں کی کتابیں جب ان کی قومیں ضائع کرتی گئیں تو آخر میں ایک پیغمبر ساری دنیا کے لئے آیا۔ چونکہ اس کے بعد کسی اور پیغمبر کی ضرورت نہ تھی اس لئے رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اب اس کی ضرورت تھی کہ اس کتاب کو جو اللہ نے اس پر وحی کی تھی' محفوظ رکھا جاتا اس کی حفاظت خدا نے اپنے ذمہ لی۔ چنانچہ دیکھ لو۔ وہ اب تک خدا کی حفاظت میں ہے۔ یہی اسلام اگلی کتابوں میں تھا۔ وانہ لفی زبر الا ولین (شعراء) ''یقیناً قرآن پہلی کتابوں میں بھی تھا۔'' چنانچہ تمام کتب سابقہ ایک دوسرے کی مصدق تھیں اور وہ اب قرآن میں آ گئیں اس لئے قرآن ان سب کا مھیمن (محافظ) ٹھہرا۔ اس لئے ہمیں حکم دیا کہ سب پیغمبروں اور ان کی تمام کتابوں پر ایمان لاؤ' قرآن پر ایمان' ان سب پر ایمان کو اپنی اندر لے آتا ہے۔ خدا ایک۔ رسول سب برحق۔ کتابیں سب ایک دوسرے کی مصدق کیونکہ سب فطرت کے مطابق تھیں اور فطرت غیر متغیر ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ اسی طرح لا تبدیل لکلمت اللہ۔

جس طرح ساری قوموں نے اول اول اصل کتاب اللہ پر عمل کیا اور اس سے دین اور دنیا کی کامیابی حاصل کی۔ رفتہ رفتہ دنیا کا خیال دین پر غالب آنے لگا تو انہوں نے کتاب اللہ کو ضائع کرنا شروع کر دیا اور اس کی جگہ بنائی ہوئی باتوں پر عمل پیرا ہو گئے۔ آہستہ آہستہ کتاب اللہ کی جگہ ان ہی باتوں نے لے لی۔ باتوں کو حدیثیں کہتے ہیں۔ تورات و انجیل کو اٹھا کر دیکھو۔ کہیں خدا کا قول نہیں ملے گا۔ ہر جگہ یہی ملے گا کہ رسول نے یہ کہا۔ نبی نے یہ فرمایا۔ یوں ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں۔

مسلمانوں کا جب تک قرآن پر عمل دخل رہا' کامیابی نے پرچم لہرایا۔ سلطنت نے عروج پکڑا۔ یہ عروج ایسا محکم تھا کہ قرآن چھوڑنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک اس کے اثرات باقی رہے۔ اس کے بعد سلطنت نے دین کو دنیا سے الگ کر دیا۔ دنیا کا خیال دین پر غالب آیا۔ اس کے لئے قرآن پیچھے ڈالا گیا اور جس طرح یہ پچھلی امتوں نے حدیثیں بنائی تھیں' انہوں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا۔ اب جو جج اور قاضی مقرر ہوتے تھے ان کی تقرری کا معیار' حدیث دانی ہوتا تھا۔ اب عزت و تکریم قرآن جاننے والوں کے لئے نہیں بلکہ حدیث جاننے والوں کے لئے تھی۔ موضوعی حدیثوں کا دروازہ کھل گیا۔ خدا نے حکم دیا تھا فاحکم بینھم بما انزل اللہ (جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو' اور فانما یسرنا بلسانک لبشربہ المتقین وتنذربہ قوما لدا (مریم) ''سو ہم نے اس قرآن کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ تو متقیوں کو اسکے ذریعے بشارت دے اور جھگڑالو قوم کو اس کے ذریعے ڈرائے۔'' یعنی فیصلے بھی مااانزل اللہ (قرآن) کے مطابق ہونے تھے اور تبشیر و تنذیر بھی اسی کے ذریعے۔ لیکن قوم نے کیا کیا۔ اسے بھی سنئے۔

خدا کا فرمان تھا کہ اے رسول ان سے کہہ دے

کہ اوحی الا ھذا القرآن لا نذرکم بہ ومن بلغ (انعام)'' یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا تھا تا کہ میں تمہیں بھی اس سے ڈراؤں اور اسے بھی جس تک یہ پہنچے۔'' یعنی جو کچھ خدا نے وحی کیا وہ سب قرآن میں تھا۔ قرآن سے باہر وحی کہیں نہ تھی۔ لیکن قوم نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ایک وحی جلی ہے جو قرآن میں ہے اور ایک وحی خفی ہے جو حدیث ہے۔ خدا نے قرآن کی تبلیغ کا حکم دیا لیکن قوم نے کہا کہ نہیں جبریل (معاذ اللہ) حضورؐ کے کان میں کہہ جاتے تھے کہ جو کچھ قرآن میں وحی کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ تم یوں حکم دو۔ مثلاً خدا نے وصیت کا حکم دیا ''للوالدین والاقربون'' جبریل نے کہا کہ یہ دکھلاوے کا حکم ہے۔ اصل حکم یہ ہے لا وصیۃ لوارث (وارث کے لئے کوئی حکم نہیں)۔ یعنی خدا نے وصیت کا حکم دیا۔ اس کی تاکید کی اور جو وصیت نہ کر سکے اس کی طرف سے خود وصیت کر دی (وصیۃ من اللہ) لیکن آیت وصیت کو حدیث نے منسوخ کر دیا۔ اور اسے ترکہ کی آیت فرض کر کے ترکہ کی تقسیم شروع کر دی۔ اور محجوب وغیرہ کا قصہ کھڑا کر دیا۔ اسی طرح قرآن نے کہا تھا کہ زنا کی سزا سو درے ہیں۔ لیکن قوم نے حدیث گھڑی اور کہہ دیا کہ زنا کی سزا سنگسار ہے۔ حالانکہ سنگسار کا حکم قرآن میں کہیں بھی نہیں۔ یہ صریح قرآن کی تحریف اور رسول پر اتہام ہے۔ غرضیکہ کہاں تک لکھا جائے۔ قرآن کا کوئی حکم اور کوئی تبشیر و تنذیر نہیں جو حدیث سے متاثر نہ کر دی گئی ہو۔

وحی خفی کو فرض کر کے حدیثوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا اور اس طرح آپ کو متہم کر دیا۔ یہ پہلی بدعت تھی جو دین میں داخل کی گئی۔ اسی سے سب فرقے بنے۔ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، شافعی، حنفی، مالکی، حنبلی اور علیٰ ھذا کس قدر فرقے نکلنے شروع ہو گئے۔ یہ سب فرقے حدیث کی وجہ سے نکلے اور مسلمان شرکوں میں داخل ہو گئے، کہ قرآن کا حکم ہے کہ

> ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون۔
>
> ''دیکھنا! تم نے مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے مسلک پر مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

یوں آخری اسلام میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور پھوٹ خدا کا عذاب ہے۔ بل ھو قادر علیٰ ان یبعث علیکم عذاباً من فوقکم اومن تحت ارجلکم اویلبسکم شیعا و یذیق بعضکم بأس بعض (انعام) ''خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت کا مزہ چکھے'' مسلمانوں نے اس پھوٹ کا خوب مزہ چکھا ہے اور بغداد کی تباہی کے بعد یہ عذاب شدید ترین شکل میں ان پر مسلط ہو چکا

ہے۔ یہ ہے راز مسلمانوں کی تباہی کا۔قرآن سے منہ موڑ کر اگر ذلیل نہ ہوتے تو اور کیا ہوتا۔انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو باقی رسومات رہ گئیں۔انہوں نے کہا کہ رسومات کو محکم طور پر قائم رکھو۔بس یہی مذہب ہے۔فقط اتنا یاد رکھو کہ فلاں چیز سنت ہے۔فلاں مکروہ ہے۔فلاں واجب ہے۔قرآن ان اصطلاحوں سے بے بنیاد ہے۔قرآن میں جس چیز کے کرنے کا حکم ہے وہ فرض ہے اور بس۔قرآن اصلاحات سکھانے اور رسومات کا پابند بنانے نہیں آیا تھا۔وہ آیا تھا مسلمانوں میں جذبۂ جہاد بیدار کرنے کے لئے۔قل ان کان اٰبائکم وابناء کم..... قوم الفاسقین (توبہ) ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان کے لوگ اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے پر تم ڈرتے ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا'' مسلمان جب تک قرآن کے متبع تھے' جہاد ان کے نزدیک سب سے بڑا فریضہ تھا۔جب جہاد سے دل چرانے لگے تو پھر قرآن کے بجائے حدیثیں جمع کرنی شروع کر دیں جن میں ذرا ذرا سی بات پر ثواب کے پہاڑ مل جانے کی ''بشارتیں'' لکھ دی گئیں۔ خدا نے قرآن کے متعلق فرمایا تھا کہ فبذالک فلیفرحوا ھو خیرا مما یجمعون ''اسی قرآن سے زندگی کی شادمانیاں حاصل کرو۔یہ ان چیزوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے پھرتے ہو' لوگوں نے اس کو یوں مذبوح کہا کہ قرآن ان خزانوں سے بہتر ہے جنہیں تم جمع کرتے ہو۔لیکن تقابل ہمیشہ ہم جنس میں ہوتا ہے۔اگر میں کہوں کہ چاند تارے میری کتاب سے بہتر ہے جنہیں تم یہ بات بے معنی ہوگی۔لوگوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔اس کو خدا نے منع فرمایا۔اور خدا کے رسول نے بھی منع فرمایا اور صاف کہہ دیا کہ لا تکتبوا عنی سوی القراٰن ومن کتب عنی شیئاً فلیمھا۔ (مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔جس نے قرآن کے علاوہ مجھ سے کچھ اور لکھ لیا ہے اسے مٹا ڈالے) اسی کے اتباع میں خلیفہ اول نے لوگوں سے فرمایا کہ تم ان قوموں کو جانتے ہو جنہوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کر دیں اور کتاب اللہ کو ضائع کر دیا۔ دیکھو تورات اور انجیل اس پر شاہد ہیں۔اسی کی تعمیل میں خلیفہ ثانی نے فرمایا کہ حسبنا کتاب اللہ (ہمارے اللہ کی کتاب کافی ہے) اور حدیثیں بیان کرنے والوں کو مجرم قرار دیا اور جلاوطن اور نظر بند کر دیا۔مگر آخر میں زمانہ بدل گیا۔ بادشاہوں کی سطوت رنگ لائی۔ حدیث کو رسول کے نام کے ساتھ منسوب کر کے بدعت قائم کی اور اسے قرآن میں ضم کر دیا۔ بلکہ قرآن پر حکم قرار دے دیا۔اب مولوی۔ مشائخ۔امام بننے شروع ہو گئے۔حضرت ابوبکرؓ ' حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ ' حضرت علیؓ میں سے نہ کوئی مولوی تھا نہ مولانا۔ نہ امام نہ کچھ اور وہ سب مومن تھے اور خدا کے بندے۔خدا کا حکم تھا کہ اتبع ما اوحی الیک من

ربک (اے رسول جو کچھ تم پر خدا کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے اس کی اتباع کرو)۔ آپ نے کماحقہٗ قرآن کی تعمیل فرمائی جس کی خدخدا نے شہادت دی۔ قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی (ان سے کہہ دو کہ میں صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی ہوتی ہے)۔ یعنی رسول اللہ نے منادی کر دی کہ میرا عمل قرآن کے سوا اور کسی چیز پر نہیں ہے اس سے واضح ہے کہ جس چیز کو قرآن نے فرض قرار دیا ہے وہی رسول اللہ کی سنت تھی۔ سنت اور فرض دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ قرآنی فرائض کے علاوہ سنت اور کچھ نہیں کہ رسول نے قرآن ہی پر عمل کیا تھا اور عمل رسول کو سنت کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہہ دیا کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (یعنی چونکہ رسول قرآن پر عمل کرتا ہے اس لئے جس نے رسول کی اتباع کی اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ بات بالکل صاف ہے قرآن سے باہر سنت کی تلاش کے یہ معنی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) زبان سے تو یہ کہتے تھے کہ میں صرف قرآن کی اتباع کرتا ہوں (انما اتبع ما یوحیٰ الیٰ من ربی) اور عملاً قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی اتباع کرتے تھے جسے اب قرآن سے باہر سنت کہا جاتا ہے۔

ہمارا لکھنا آپ صاحبوں کو برا معلوم ہوگا۔ لیکن میں اب اگلی منزل سے بہت قریب ہوں اس لئے میں نے جو کچھ حق سمجھا اسے کھلے الفاظ میں کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور خدا کو ایک دم بھول چکے ہو۔ میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ اللہ اللہ ہے اور لا یشرک فی حلمہ احداً (وہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کیا کرتا)۔ آپ خدا کو کافی سمجھئے پھر دیکھئے کہ خدا آپ پر ویسا ہی مہربان ہو جائے گا جیسا پہلے تھا۔ اپنے بدعتی خیالات سے دین کو خالص کروالا للہ الدین الخالص (دین خالص صرف اللہ کے لئے ہے)۔ بس دین خالص میں (جو قرآن کے اندر ہے) مسلمانوں کی تمام فلاح و بہبود مضمر ہے۔ جس دین میں بدعت کی آمیزش ہو جائے وہ دین خالص نہیں رہا کرتا اور ''ملے جلے دین'' کا نتیجہ (جسے خدا شرک قرار دیتا ہے) ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک جی چاہے اسے آزمالو۔ یہ اللہ کا قانون ہے جو نہ پہلی امتوں کے لئے بدلا ہے نہ تمہارے لئے بدلے گا۔ مسلمانو! ایک مرتبہ پھر کہو کہ

حسبی اللہ۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر

میرے لئے اللہ کافی ہے۔ وہی بہترین آقا ہے اور وہی بہترین مددگار۔

پھر اس کے بعد دیکھو کہ اس کی ولایت اور نصرت کفایت کرتی ہے یا نہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد حسین عرشی مرحوم

نکاتِ تلاوت

مختلف تاریخوں میں حاصل کئے ہوئے تلاوتی نکتے مائدہ طلوع اسلام پر چن رہا ہوں کہ اہل ذوق قارئین کو اپنی تنہائیوں کی لذتوں میں شریک کروں۔

۱۔ حقیقتِ علم

زیر تلاوت رکوع میں ایک آیت سامنے آئی اس سے ایک نئی روشنی حاصل ہوئی جس پر پہلے کبھی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ میں تو کہتا ہوں کہ قرآن عزیز ہمیشہ ہی اپٹوڈیٹ (Up-to-Date) اور دائم الجمال چیز ہے۔ اس کی جدتوں اور ندرتوں کی کوئی تھاہ نہیں۔ اس کے حسن لازوال کے کتنے گوشے ہیں جو ابھی اہل نظر، مشتاقان جمال کی نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ ان کو کون شمار کرسکتا ہے؟ سچ کہا ہے:

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز
اندکے خود را در آیاتش بسوز!
(اقبال)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدماء مفسرین نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا چڑیا سمندر سے اپنی پیاس بجھانے کے لئے لیتی ہے اور قیامت تک کے غواصان قرآن ایسے ہی اپنی اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے اور یہ لاہوتی سمندر ایسا ہی عمیق اور اتھاہ رہے گا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

فرماتے ہیں۔۔ ''جب کفار کو قرآن مجید اور پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا''۔۔ یعنی وہی پرانا طریقہ، شرک، کفر، فسق وفجور وغیرہ۔۔ ان سب کے جواب پر الٰہی تنقید سننے اور سمجھنے کی چیز ہے۔۔ ارشاد ہوتا ہے۔۔ اولو کان اٰبائھم لا یعلمون شیئاً ولا یھتدون۔ یعنی۔۔ اگرچہ ان کے بزرگ باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی ہدایت پاتے ہیں۔

براہ کرم زیر خط الفاظ ایک مرتبہ اور دیکھیں ''لا یعلمون شیئاً'' یعنی۔۔ کچھ بھی نہ جانتے ہوں۔۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ مخاطبین کے آباء واجداد پشت در پشت محض بھیڑ، بکری کی قسم کے حیوان

لا یعقل ہی ہوتے رہے ہوں۔ کفار میں بڑے بڑے عقلمند منتظم اور حکیم وفلسفی ہوگزرے ہیں۔ ہم کس طرح مان لیں کہ وہ قطعاً کچھ (شیـــئـــاً) نہیں جانتے تھے یعنی محض پتھر تھے' کیونکہ آخر حیوان بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں' اپنی خوراک کو غیر خوراک سے' مالک کو غیر مالک سے' مسکن کو غیر مسکن سے تمیز کرتے ہیں۔ اپنے بچے کو دوسرے کے بچے سے پہچانتے ہیں۔ (وغیرہ وغیرہ) پھر کیونکر تسلیم کرلیا جائے کہ ابوجہل جو ابوالحکم کہلاتا تھا اور ابولہب جو بڑا صاحب اثر رئیس تھا اور فرعون و ہامان وقارون جو لاکھوں انسانوں پر اثر رکھتے تھے' بالکل ''لا یعلمون شیئاً'' تھے۔ یعنی کچھ جانتے ہی نہ تھے؟

مجھ سے پوچھتے ہو تو میں بغیر کسی ایچ پیچ اور دل کی پوری تسلی اور یقین سے کہتا ہوں کہ جس نے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کو نہیں جانا اس نے بہت کچھ جاننے کے باوجود کچھ بھی نہیں جانا۔ اور جس نے اس منبع حسن و جمال اور مخزن خیر و کمال کا کوئی گوشہ پالیا تو اس نے سارے علم سیکھ لئے اور ساری دولتیں حاصل کرلیں۔

جان جملہ علمہا این است' ایں
کہ بدانی من کیم در یوم دیں

(رومی)

ابوبکر شبلی رحمتہ اللہ علیہ اپنے شیخ طریق حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کرتے ہیں: ''حضرت! مجھے سارے علوم سکھا دیجئے تاکہ آنکھوں کے سامنے سے تمام حجاب اٹھ جائیں اور آخرت کا راستہ صاف دکھائی دینے لگے۔''

''عزیز من! تم تمام علوم پر حاوی ہو جانا چاہتے ہو''۔ جنیدؒ نے کہا۔

''ہاں حضرت!'' جواب شبلیؒ۔

''تو قلم' دوات اور کاغذ لے آؤ! آج ہم تمہیں تمام علوم لکھوا دیتے ہیں۔'' ارشاد جنیدؒ

شبلیؒ اٹھے اور بھاگے بھاگے قلم' دوات اور کاغذات کا ایک مٹھا لئے ہوئے حاضر خدمت ہوگئے۔ دل میں بہت خوش کہ آج سے مبارک کون سا دن ہوسکتا ہے' شیخ اتنے مہربان ہیں کہ سارے ہی علوم سکھا دینے پر آمادہ ہیں۔ الحمدللہ۔ عرض کیا:

''حضرت! کاغذ' قلم' دوات حاضر ہے۔''

فرمایا۔ ''لکھو۔ اللہ''

شبلی نے لکھ لیا اور عرض کیا:

''حضرت آگے''؟

فرمایا ''بس۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔ تمام علوم و اسرار' تمام نعائم ولذائذ' تمام دولتیں اور خوبیاں اور جو جو کچھ تم اور تمام مخلوقات تصور کرسکے اور جو سب کے تصورات سے باہر ہے' وہ سب کچھ اسی ایک لفظ میں موجود ہے۔ اسی کو سمجھو' اسی کو جانو' اسی کو پہچانو۔ ہر مراد حاصل اور ہر مدعا میسر ہوجائے گا۔''

تم مل گئے تو دولت کونین مل گئی
پائے طلب میں اب خلشِ جستجو نہیں

فرعون جب اس جہان سے رخصت ہوا' اس کے علوم' اس کی پیش بینی وفراست' اس کا دبدبہ وسیاست' اس کا

دعویٰ الوہیت اور اس کے اسباب عروج و کمال کہاں تھے۔۔ پاکستان کے کیمرج اور آکسفورڈ یافتہ سیاست دانو! تمہیں اس کے مرتے وقت کے الفاظ یاد نہیں؟ مجھ سے سنو! نہیں نہیں اس کی زبان مبارک سے سنو جو اس وقت بھی اس کے پاس موجود تھا اور آج بھی تمہاری اور میری رگ گردن سے زیادہ ہمارے قریب ہے۔(جل شانہ وھوا لحی الذی لا یموت)

اذا ادرکہ الغرق ۔۔ٹھیک اس وقت جب فرعون ڈوب رہا تھا۔

قال ۔۔۔اس نے کہا۔۔۔

امنت انہ لا الہ الا الذی امنت بہ بنو اسرائیل و انا من المسلمین O

میں مان گیا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس کو بنی اسرائیل مانتے ہیں اور میرا سر تسلیم خم ہے۔

آہ اس وقت مانا جب ماننے کا کوئی فائدہ نہ رہا' جب ادھر کی آنکھ بند ہو چکی اور ادھر کی آنکھ کھل گئی اور جو کچھ موسیٰؑ کہتے تھے دکھائی دینے لگا۔۔ اور ادھر کے کان بند ہو گئے' ادھر کی آواز سنائی دینے لگی۔

الان وقد عصیت قبل و کنت من المفسدین ۔الخ

(او ظالم!) اب مان رہا ہے حالانکہ پہلے تو نے کوئی بات نہ مانی اور فساد ہی مچاتا رہا۔

تو مطلب یہ نکلا کہ وہ معلومات جو انجام کار ہمارے کسی کام نہ آئیں' ان کا جاننا نہ جاننے کے برابر ہے' جیسے بخیل کی دولت جو اس کے کام نہیں آتی' دراصل وہ اس کی ہے ہی نہیں۔ وہ اس کے ہوتے ہوئے مفلس بلکہ مفلس سے بدتر ہے' کیونکہ مفلس اس کی حفاظت کے عذاب میں تو مبتلا نہیں۔

علم رابر دل زنی یارے بود
علم را برتن زنی مارے بود
علم اہل دل بود حمال شاں
علم اہل تن بود احمال شاں

اور یوں بھی دیکھو تو اکابر انبیاؑء نے کون سی یونیورسٹی اور کس کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اللہ کو جانا تو سب کچھ جان لیا۔

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی

۲۔ علم غیر نافع

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ بعض بڑے بڑے اہل علم جو عربیت کے علامہ' تفسیر کے ماہر اور تقریر و تحریر کے دھنی ہیں' عملی لحاظ سے عوام سے بھی کیوں گئے گذرے ہیں۔ نہ ان کی نگاہ محتاط' نہ نیت پاک اور نہ ہی نجی طور پر ان کی زبان شائستہ ہے۔ میں نے ایسے بزرگوار ''چوں بخلوت می روند'' کے مجسمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں' ان سے معاملہ کیا ہے۔ دنیا ان کو مقدس دینی رہنما کی حیثیت سے مانتی تھی اور مانتی ہے' لیکن ان کی پرائیویٹ زندگی نہایت گھناؤنی اور خوف خدا سے بڑی حد تک خالی نظر آئی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ جو آیتیں وہ ہم عامیوں کو سناتے ہیں ان سے ہمارے دل کانپ جاتے ہیں۔ وقتی طور پر سہی' ہم جاہلوں پر اثر تو ہو جاتا

ہے۔لیکن ان مقدسین علمائے کرام ومشائخ عظام پر کیوں اثر نہیں ہوتا۔ یہ خدا سے کیوں نہیں ڈرتے' ان کو عاقبت کا اندیشہ کیوں نہیں؟ آج زیر تلاوت رکوع میں اس کا جواب مل گیا۔۔ ہمارے محبوب ومولا اللہ پاک فرماتے ہیں:

ومنهم من يستمع اليک و جعلنا على قلوبهم اكنتة ان يفقهوه و فى اذانهم و قراوان يروا كل اية لا يومنوا بها۔ الخ

اب اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ آخری پیغمبر ﷺ زندہ ہیں اور اپنی زبان وحی ترجمان سے قرآن پاک کی تلاوت فرما رہے ہیں' اور سننے والے وہ ہیں جو ہمارے شمس العلماؤں سے بھی زیادہ عربی کو جاننے اور سمجھنے والے ہیں' کیوں نہ ہوان کی مادری زبان ہے' لیکن پھر بھی ان کے متعلق آسمان کا اٹل فیصلہ یہ ہے:

ترجمہ آیت۔۔ ان میں سے بعض ایسے جو (اے محمد ﷺ) تیری بات کو کان لگا کر سنتے تو ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر حجاب ڈال رکھے ہیں تاکہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں کو بھی حقیقت میں بہرا ہی بنا دیا ہے' وہ کوئی بھی نشان دیکھیں اس پر ایمان نہیں لاتے۔

اب سننا اور عربی دان ہونا کیا فائدہ دے سکتا ہے' جب اللہ تعالیٰ ہی دل اور کانوں پر پہرے بٹھا دیں کہ کوئی حق بات اثر ہی نہ کرنے پائے۔ اور یہ جبر بھی نہیں' انسان کے اپنے میلان ورجحان کی وجہ سے اس قسم کے پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے تو جو لوگ علم میں پختہ ہیں ڈرتے اور دعائیں کرتے رہتے ہیں:

ربنا لا نزغ قلوبنا بعد اذهد يتنا۔ الخ

اے ہمارے رب! جب آپ ہمیں ہدایت کی دولت دے چکے تو اس کے بعد ہمارے دلوں کو کج فہمی سے بچائیو۔

یعنی ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی گم راہ ہو جانا کچھ بعید نہیں اور جو شروع ہی سے ہدایت کی طرف مائل نہ ہو اور محض کاروباری حیثیت سے حدیث وتفسیر کو استعمال کرتا ہو وہ اس کے مقصود حقیقی کو کیونکر پا سکتا ہے۔

رب اعوذبک من همزات الشيطين واعوذبک رب ان يحضرون۔

اے میرے رب میں شیطان کے ہتھکنڈوں سے آپ ہی کی پناہ چاہتا ہوں اور اس سے بھی آپ ہی کی پناہ چاہتا ہوں کہ میرا شیطانوں سے سابقہ پڑے۔

ہمارے نوجوانوں کی فرنگ زدگی اور الحاد پذیری کو بہت کوسا جاتا ہے اور یہ صحیح بھی ہے' لیکن اس کے پس منظر کو دیکھیں تو اس میں انگریز کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ ان مقدس نما بزرگوں کا بھی کچھ کم دخل نہیں۔ جو لوگ ان کے اندرونی کردار سے واقف ہو جاتے ہیں وہ سرے سے دین ہی سے

بیزار ہو جاتے ہیں کہ جس دین کے نمائندے ایسے ہیں وہ دین کیسا ہوگا۔شہنشاہ جلال الدین اکبر کے متعلق بالکل سچ ہے۔ ع

تخم الحادے کہ اکبر پرورید

لیکن تاریخ ہی بتاتی ہے کہ اکبر کا بچپن کافی دیندارانہ تھا۔۔ آخر اس وقت کے مولانا مخدوم الملک کی قسم کے بزرگ..... جب اس کے سامنے اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہوئے اور دوسری طرف فیضی وابوالفیض ایسے ملا اس کی نئی نئی دین سے بیزاری کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑے تھے تو اسے تخم الحاد کی پرورش سے روکنے والا کون ہوسکتا تھا۔۔ آج بھی یہی حال ہے۔ پیرو ملا ایک متعفن قسم کے مذہب کو اسلام کے نام سے پیش کر رہا ہے۔نوجوان اس سے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے منہ پھیرتا ہے تو دوسری طرف اسے فرنگیت کی نازک اندام پری الحاد کا تحفہ ہاتھ میں لئے خیر مقدم کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔اب وہ بیچارہ کہا جائے۔

''کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری''

۳۔ جرائم پیشہ قوم

آج زیر تلاوت آیات میں آیت ذیل دل میں چبھ گئی۔

ولا یرد باسه عن القوم المجرمین۔

جو لوگ قومی حیثیت سے جرائم پیشہ ہو جائیں ان پر سے اللہ کا عذاب ٹل نہیں سکتا۔

اس کی اوپر کی آیت کے آخری ٹکڑے نے اس کے مضمون کو اور بھی ہولناک بنا دیا ہے۔

وانا الصادقون ۔۔۔ہم (اللہ) قطعی سچ کہنے والے ہیں۔

مجھے اپنی قوم کا خیال آ گیا۔اکابر واصاغر، جہلاء و علماء، حاکم ومحکوم سب کے سب عظیم اکثریت کے لحاظ سے مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔یا اللہ! اس قوم کا کیا بنے گا؟

آوازۂ حق اگر کہیں ہے تو بہت مدہم۔۔۔ اور عموماً اس کے پیچھے بھی خلوص بہت کم اور وہی عوامی جرائم پیشگی اپنی طوفانی شان کے ساتھ۔یہ ''انا الصادقون'' کہنے والے کا قول کبھی آج تک ٹلا نہیں اور اب ٹلنے کا نہیں۔اگر اس کے علم میں روس مجرم ہے تو وہ پکڑا جائے گا۔۔امریکہ اور اس کے حوالی موالی مجرم ہیں تو وہ بھی نہیں چھوٹیں گے۔فریقین مجرم ہیں تو کوئی بھی نہیں بچے گا۔دنیا بھر کے آثار اچھے نہیں، مہلت دینے والا بہتر جانتا ہے کہ کتنی مہلت مناسب ہے اور کب گرفت آ جائے گی۔ اس تصور کے تحت آج کل میرے وردزباں یہی آیت رہتی ہے اور میں اپنے دوستوں کو بھی اس طرف توجہ دلاتا ہوں:

رب نجنی واهلی مما یعلمون

(دعائے لوطؑ) میرے رب! مجھے اور میرے اہل و عیال کو ان لوگوں کی بداعمالیوں (کے نتائج) سے بچالے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلم کریلوی

جمہوریت جنگ ہے زرگری

جمہوریت' اسلام میں امت کی امنگوں کا مظہر ہوتی ہے جس میں اقتدار اعلیٰ خدائے واحد کو حاصل رہتا ہے اور امت کے منتخب کردہ نمائندگان' وحی خداوندی کے عطا کردہ قوانین کو بروئے کار لانے کا ذریعہ جو عملاً ان احکامات پر زندگی کو استوار رکھتے ہیں اور قانون کی بالادستی کو عدل کی کسوٹی پر جانچ کر عوام کو اس کا پابند رکھتے ہیں۔ اسلامی جمہوریت میں حدود اللّٰہ کہ اطاعت و وفا شعاری اسلام کے دعویداروں پر فرائض کی ادائیگی زندگی کے ہر گوشے پر حقوق العباد کی شکل اختیار کئے رکھتی ہے۔ رب العزت نے نظام مملکت کے ضابطہ حیات قرآن کریم کی لاریب کتاب میں امت مسلمہ کے لئے احکام و ہدایت اور ان پر عمل درآمد کے حدود متعین کر دیئے ہیں یوں سمجھو کہ اسلامی جمہوریت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے جس میں امت کی آزادی اور پابندی' حدود اللہ کے اندر مضمر ہوگی خواہ وہ سیاست ہو یا معاشرتی اصلاحات کا نفاذ' امت میں رفاقت کا ہر طریقہ کار ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے جو قرآن کریم نے متعین کر دیئے ہیں لیکن ان کی جزیات ترکیبی جو حاکم مطلق نے خود متعین نہیں کی' مستقل اقدار و احکامات جو غیر متبدل ہیں ان کے علاوہ امت مسلمہ کو آزادی ہے وہ قرآن کریم کی بیان کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے وقت کے مطابق مناسب ترین شکل میں اختیار کریں جو عدل و انصاف پر مبنی ہوں اسے تو اسلامی جمہوریت کہا جائے گا جس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمران اک وہی باقی بتان آذری

باقی سارے سسٹم خواہ وہ مغربی جمہوریت کے ہوں یا پاکستانی جمہوریت ہر جمہوری نظام ذاتی برومندی کا مظہر ہوتا ہے اس میں اقتدار اعلیٰ خدائے واحد کا نہیں ہوتا سینکڑوں منتخب کردہ ''خداؤں'' کا ہوتا ہے جو کاغذات نامزدگی کی صورت میں معزز و صاحب کردار تسلیم کئے جاتے ہیں خواہ ان کا کاروبار گراں فروشی کا ہو یا ہیروئن فروشی ہو'

جن میں ایسے تاجر بھی ہیں جن کا پیشہ' تجارت' جمہوریت کے حصول میں لاکھوں لگا کر کروڑوں کا کمانا ہے۔ جمہوری شراکت دار' کامیابی کی صورت میں صاحب اقتدار اور ناکامی کی صورت میں تخریب کار جو اپنے اغراض و مقاصد میں حقوق انسانیت کو سلب کرتے ہیں بھارتی جمہوریت ہو یا مغربی جمہوریت ان کا مقصد ذرائع پیداوار اور معیشت پر قبضہ کرنا ہے جیسے امریکی عزائم' خلیجی ممالک کو یرغمال کئے ہوئے ہیں عراق پر اس کی بلاجواز بم باری اور افغانستان میں بے قصور انسانیت کا قتل عام' غنڈہ گردی کی مثال ہے یا بھارتی جمہوریت میں کشمیری مسلمانوں کا قتل عام ان ہر دو غنڈوں میں کیا فرق رہ سکتا ہے سوائے اس کے کہ ایک مہذب کہلاتا ہے اور دوسرا غیر مہذب خواہ وہ سیاسی استحصال کرنے والے ہوں یا شرف انسانیت کو پامال کرنے والے ہوں ڈاکو کہلاتے ہیں اور ڈاکوؤں سے خیر و سلامتی کی توقع رکھنا خود فریبی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے جس سسٹم میں اوپر سے نیچے تک خرابی ہو اس سسٹم کے کیا کہنے؟ یہی کہ اس سسٹم کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہئے قوم اتنے سارے تجربات کی متحمل نہیں ہوسکتی جب کہ ملک کا متوسط مسکین طبقہ روٹی تک سے محتاج ہے جو الیکشن و انتخاب کی آلودگی میں جیتے جی مر رہے ہیں جنہیں کسی بھی جمہوریت نے عزت سے زندہ رہنے کا حق نہیں دیا ان کے نزدیک ہر جمہوریت اونٹ کی مثال ہے جو حکومتوں کے اتار چڑھاؤ میں پس کر رہ جاتے ہیں بادشاہت ہو یا آمریت مغربی جمہوریت یا مشرقی ہر جمہوریت نے غریب اکثریت کا استحصال کیا ہے جس کا منہ بولتا ثبوت ان کی غربت ہے۔ ان حالات میں خدائی نظام' نظام ربوبیت جس کا سیاسی نظام قرآن کریم نے دیا ہے اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ گو کہ یہ ایک کٹھن راستہ ہے مگر دوررس نتائج کا حامل ہے۔ اس کے سوا انسانوں کی کوئی وضع کردہ حکومت اسلامی نہیں کہلا سکتی اسلامی حکومت اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نام ہے اس سلسلے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ جو کوئی اسلام کے سوا اور کسی نظام کا خواہاں ہوگا وہ نظام عدالت خداوندی میں قابل قبول نہیں اس لئے کہ وہ کارگہ کائنات میں کسی بھی صورت فٹ نہیں بیٹھ سکتا۔ جب کہ معاملہ صرف ذہنیت بدلنے کا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرے۔ اگر آپ پاکستان میں حقیقتاً جمہوریت کے خواہاں ہیں تو اسلامی قدروں کا احترام کریں جنہیں مذہبی پیشوائیت نے چیستان بنا رکھا ہے مغربی جمہوریت خود غرضی کا نظام ہے ملک سے بددیانتی اور رشوت کا خاتمہ ہو جائے تو یہ بھی اہل پاکستان کی خوش بختی کا ثمر ہے ملک اور عوام کی تمام مشکلات کا حل اسلامی رواداری اور یکجہتی میں مضمر ہے جو صراط مستقیم ہے اس پر چلنا ناممکن نہیں بشرط کہ عزائم نیک نیتی پر مبنی ہوں تو یہ راستہ اتنا کٹھن نہیں۔

کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفان سے کیا
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجم ہلال صدیقی

نفس، نفسیات اور نفسانفسی

آج کل کی ہنگامہ خیز زندگی میں انسان بری طرح سے نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو چکا ہے اور اعصابی کمزوریوں میں مبتلا رہتا ہے۔ دنیا بھر میں کوئی بھی ملک انسانی نفسیات کے لئے ٹھوس حکمت عملی وضع کرنے میں کامیاب نہیں رہا اور انسانی خوشحالی کلی طور پر حاصل کرنا ابھی باقی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر دنیا کے بیشتر ممالک ایک دوسرے کے ساتھ اعصابی جنگوں میں مشغول ہیں جسے ہم سرد جنگیں بھی کہتے ہیں۔ تو ظاہر ہوا کہ انسان کو ذہنی کشمکش میں قصداً مبتلا رکھا جا رہا ہے اور اس کے جذبات کو ٹھنڈا یا سرد کرنے کی بجائے اسے سرد جنگ کی نظر کیا جا رہا ہے۔ انسانی نفس اس کا وجود اور اس کی ذات کہلاتی ہے۔ اس کی جان میں اس کی روح جسمانی اور روحانی دونوں صلاحیتوں میں سکون طلب ہے۔ مگر انسان کو سکون میسر ہی نہیں آتا۔ بزرگوں سے سنتے اور کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ انسان کے ارتقائی عمل میں رب تعالیٰ کی ذات صرف چار عناصر شامل کرتی چلی آ رہی ہے۔ جن میں ذہانت، تصور، علم اور ہنر قابل ذکر ہیں مگر سکون انسان از خود حاصل کرتا ہے۔ ماہر نفسیات دان سکون کو بھی اندرون جسم تلاش کرنے پر زور دیتے ہیں۔ بقول شاعر۔

جیسا موڈ (Mood) ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے

سکون اور سکھ چین، انسان سے فقط خواہش نفسانی کے جنم لینے سے ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ آج کل کے انسان نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور ان کی پرستش میں شب و روز تگ و دو کر رہا ہے اور یکے بعد دیگرے ان پر عبور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا نفس کی وابستگی انسانی جان، حقیقت اور اصلیت کو ظاہر کرتی ہے اور نفسیات، نفس سے متعلقہ باتیں۔۔ بالآخر ہم نفسانفسی کے عالم میں انسان کو پاتے ہیں جو صرف خود غرضی کے علامت بن چکا ہے۔ یہ سب کیوں اور کیسے اُمڈتا ہے؟ اس کا جواب غور طلب ہے۔

انسانی تاریک تین ادوار پر مشتمل ہے۔ جنہیں ہم ماضی، حال اور مستقبل کہتے ہیں اور ہر دور میں انسانی معاشرہ

تین ہی طبقات میں پایا جاتا ہے یعنی امیر، متوسط اور غریب۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ دنیا میں ادوار، طبقات اور نسلیں محض اس لئے قائم و دائم رکھی گئی ہیں کہ انسان کو ایک دوسرے کی پہچان ہو۔ قرآن مجید فرقان حمید میں بھی ہمیں ان ہی عوامل سے آگہی اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

وطن عزیز کے سب شہری اپنے نفوس کے ساتھ طبقاتی نفسیات لئے نفسانفسی کی کیفیات میں جکڑے پائے جاتے ہیں۔ انسان گو کہ آزاد پیدا ہوتا ہے مگر وہ دنیا کے چاروں طرف زنجیروں میں جکڑ بند ہے۔ ان جیسے مشاہدات اور تجربے ہمارے لئے نئے نہیں ہیں بلکہ انسان کی تاریخ سے رقم کئے جاتے رہے۔ ہمارے ماضی کو ہمارے آج کا دانشمند، ادیب اور مفکر نت نئے تجزیات سے نئی راہیں ترتیب دینے کے لئے مصروف عمل ہے اور ان ہی کی روشنی میں مستقبل کے خوش آئین محرکات لانے کا متلاشی۔ ہمیں معلوم ہو چکا کہ گذشتہ کئی سالوں سے امیر طبقہ امیر تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور غریب غریب تر۔ اگر گندم کے دانے کی طرح یا مصالحے کی طرح سل بٹے میں کوئی پسا ہے تو ہمیشہ کی طرح متوسط الحال یا درمیانی معاشرتی طبقہ۔ امیر کے لئے اس کی دولت آسودگی کا ذریعہ ہے اور غریب اپنی غربت ہی میں آسودہ حال ہے مگر نہ امیر نہ غریب درمیانی حیثیت رکھنے والا طبقہ جائے تو کہاں جائے اور کرے تو کیا کرے؟ اپنے نفس سے غیر مطمئن یہ طبقہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنر مند ہونے کے باوجود بے روزگار جیسی لعنت میں دکھیلا اور اسی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔

آج کل غربت مکاؤ پروگرام کے ذریعے بے روزگار کو ختم کرنے کے پہلے قدم کے طور پر حکومت نچلے طبقے کے لوگوں خاص کر غریب مزدوروں کو روزگار فراہم کرنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہے اور اس کا پرچار بھی بہت ہے۔ مگر حکومت کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مزدور کی فقط سو روپے کی دہاڑی پر روزگار کی فراہمی اس کے گھریلو اخراجات کے لئے کافی ہے یا کہنا کافی؟ جبکہ آئے دن کی مہنگائی اس کی غربت مٹاؤ کی بجائے غربت بڑھاؤ کا سرچشمہ بنتی جا رہی ہے۔ مہنگائی مٹاؤ پروگرام ہی اصل خوشحالی فراہم کرنے کا موجب بن سکتا ہے۔ غریب طبقے کی غربت کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے کی بے روزگاری مٹانے کے لئے بھی لائحہ عمل بہر عنوان تشکیل دیا جانا اور فوری طور پر نافذ العمل کرایا جانا چاہئے۔ اس طرح ہر پاکستانی اپنا نفس لئے نفسیاتی کھنچاؤ، دباؤ اور کشمکش سے آزاد شہری کی حیثیت سے مملکت خداداد کی بطور احسن خدمات سرانجام دے سکے گا اور نفسانفسی کا دور دورہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا۔ باروزگار پاکستانی خوشحالی پاکستان کا ضامن ہوگا۔ امیر کو امیر تر نہ رہنے دیا جائے ٹیکس ایمنسٹی سکیم اور دیگر ٹیکس نیٹ ورکس کے ذریعے وطن عزیز کی ترقی اور کامرانی کو یقینی بنانا حکومت کی ترجیحات ہونی چاہئیں۔ امیر کی مرگ کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الہٰ آبادی نے کیا خوب کہا تھا:

کوئی مرے تو دیکھ کہ کیا لے گیا وہ ساتھ
بے کار ہے یہ بحث کہ وہ چھوڑ کیا گیا

مندرجہ بالا شعر اکبر الہٰ آبادی نے اپنے مرنے سے پہلے 75

برس کی عمر میں 1921ء میں ہمیں بخشا تھا جو آج بھی سدا بہار ہے اور ماضی کی طرح حال اور مستقبل دونوں میں عمل پیرا رہے گا۔ ایک اور صداقت کئی اور سنہری صداقتوں میں سے اکبرالہٰ آبادی فرما گئے کہ

''ہے قوم تو بے زر مگر اڑتا ہے زر قوم''

قومی دولت قوم کی امانت ہے اسے سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہئے وگرنہ ہمارے نفوس ہمیں نفسیاتی مسائل میں دھکیلتے چلے جائیں گے اور وسائل نہ ہوتے ہوئے ہم نفسانفسی کے ساتھ ساتھ خدانخواستہ افراتفری کی دلدل میں پھنستے ہوئے تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ع

خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
یہی دعا ہے دوستو خدا سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانان ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں' حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانان ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں' ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشان منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح وسلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار' بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس وحزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا' ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے

نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفا شعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد' وہ مسلمانان ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنا لیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے' پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشان منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغ راہ (یعنی وطنی' نسلی' لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر' محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن' فی الحقیقت مسلمانان ہندوستان کی زندگی میں' ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے' قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت' مسلمانان ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو' اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتاب زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد' اس منزل تک پہنچنے کے لئے

مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلاب عظیم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیات ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلا شائبۂ تشکیک' قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح' حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف' اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے' تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر' لباس مجاز میں سامنے آ جائے' وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؔ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں' اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرا
جزاء بما کانوا یکسبون (۹/۸۲)

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے' انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ

> ہندوستان میں' بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے' اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات وتصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

> اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم' اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے' ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں

ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دور ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؔ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

> لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر' اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔ لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔ باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سو اس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔ یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔ قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ **ماخلقکم ولا بعثکم الا کنفس**

واحـدة (۳۱/۲۸)۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔ بلوچی ہے یا سرحدی۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

انا هدینٰه السبیل اما شاکرا واما کفوراً (القرآن:۷۶/۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی سائنٹفک تعبیر

سوال: اگر قرآن کریم کی تعبیر سائنس کے انکشافات کی رو سے کی جائے تو اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کل کو اگر سائنس کے موجودہ نظریات غلط ثابت ہو گئے تو اس سے قرآن پر حرف آئے گا۔اس کی وضاحت کر دیجئے۔

جواب: قرآن کریم کا ایک حصہ اس کے قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہے۔اسے وہ محکمات سے تعبیر کرتا ہے اور یہی ام الکتاب ہیں یعنی وہ انسانوں کو جو راہنمائی دینا چاہتا ہے اس کی اصل اور جڑ یہی ہیں۔اس حصہ کا مفہوم متعین اور مطالب واضح ہیں' اس لئے اس کی تعبیرات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ان قوانین اور اصولات پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔انسانی علم کی وسعت' ان کی رفعت' ہمہ گیریت اور افادیت کے دلائل بہم پہنچائے گی۔

قرآن کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنے دعاوی کی صداقت پر خارجی کائنات سے شہادات پیش کرتا ہے۔اس کے لئے وہ کارگہ کائنات کے نظم ونسق' قوانین خداوندی کی محکمیت۔تخلیق ارض وسما۔تنویر شمس وقمر' تکویر لیل ونہار' غرضیکہ انفس وآفاق میں آیات اللہ پر غور وفکر کی تاکید کرتا ہے۔اسی حصہ میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔انہیں وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں پیش کرتا ہے۔یہ وہ حصہ ہے جس میں مختلف زمانوں میں مختلف تعبیرات سامنے آسکتی ہیں۔اس لئے کہ ان امور پر انسان اسی حد تک غور وفکر کر سکتا ہے جس حد تک اس کے زمانے میں انسانی علم ترقی کر چکا ہے۔اگر ایک دور کا انسانی علم' مشاہدہ یا تجربہ کسی سابقہ دور سے مختلف ہوگا تو اس دور کی تعبیرات بھی سابقہ دور سے مختلف ہوں گی۔مثلاً قرآن کریم نے فرعونِ (حضرت) موسیٰؑ کی لاش کے متعلق کہا کہ **فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک اٰیۃً** (۱۰/۹۱) ''پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ تو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں' ایک نشان ہو''۔اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں مصریات کے متعلق تحقیق نہیں ہوئی تھی' اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وہاں کے شاہی مقبروں کی کھدائی ہوئی تو ان سے

بیشمار حنوط شدہ لاشیں (ممی) برآمد ہوئیں۔ انہی میں رامیسیس ثانی کی لاش بھی برآمد ہوئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون تھا۔ اس انکشاف کے بعد قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کی تعبیر بھی مختلف ہوگئی۔ اس مثال کا تعلق تاریخی انکشافات سے ہے۔ دوسری مثال فلکیات سے متعلق لیجئے۔ قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے۔ **کل فی فلک یسبحون** (۲۱/۲۳)۔ تمام (ستارے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ جب فلکیات کے متعلق قدیم تصور کارفرما تھا تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب جدید انکشافات کی رو سے فلکیات کے متعلق نئی ''آیات'' (نشانیاں) سامنے آئیں تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور ہوگئی۔ تعبیرات کے ان اختلاف سے قرآنی حقائق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے زمانے کی کوئی علمی تحقیق سابقہ دور کی کسی تعبیر کو غلط ثابت کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس زمانے کا انسانی علم ناقص تھا۔ اور اگر آج کی کوئی تعبیر بعد میں آنے والے زمانے نے غلط ثابت کر دی تو یہی بات آج کے انسانی علم کے متعلق کہی جائے گی۔ لہٰذا اس باب میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم قرآنی حقائق کو علم انسانی کی موجودہ سطح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، لیکن اپنی فہم، اور اسپر مبنی تعبیر کو حرف آخر قرار نہ دے لیں۔ اس لئے کہ حقائق کی لامتناہیت کا تو یہ عالم ہے کہ **قل لو کان البحر مدد الکلمٰت ربی لنفذ البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً** (۱۸/۱۰۸) ان سے کہہ دے کہ اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ایسے ہی سمندر اور پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کر سکیں۔'' حقائق کی یہی لامحدودیت ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کراتھر نے کہا ہے کہ ''ہمیں کسی موضوع پر حرف آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہئے۔''

یاد رکھئے۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ اگر ہم اس کے حقائق کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ ہمارے تدبر کا قصور یا ہمارے زمانے کی علمی سطح کا نقص ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس خیال سے کہ ہم قرآنی حقائق کے سمجھنے میں کہیں غلطی نہ کر جائیں، ہم ان حقائق پر غور و تدبر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جس خدا نے غور و تدبر کا حکم دیا ہے اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ انسانی غور و فکر غلطی بھی کر سکتا ہے اور جس دور میں غور و فکر کرنے والا انسان پیدا ہوا ہے اس دور کی علمی سطح بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خارجی کائنات پر غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے اور قرآنی حقائق پر بھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ **سنریھم ایاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق** (۴۱/۵۳) ''ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق ہیں دکھائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) واقعی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔'' اس باب میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) بس اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ غور و فکر کرنے والا اپنی تعبیر کو حرف آخر نہ سمجھ لے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء کرام سے گذارش

ابھی میں بچہ ہی تھی کہ پہلی بار میرے ذہن میں دین اسلام کے حق ہونے کے بارے میں ایک شبہ پیدا ہوا کہ سب مذاہب کے لوگ اپنے مذہب کو درست خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کے مذہب کو غلط خیال کرتے ہیں اور اسی طرح مسلمان بھی خود کو حق پر سمجھتے ہیں تو کیا خبر کہ صحیح مذہب کونسا ہے؟ اور سب ایک دوسرے کو غلط سمجھتے رہتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایسے ماحول میں تھی کہ مجھے ان سوالات کا جواب مل گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ہی صحیح دین ہے۔

لیکن بچپن کی یہ الجھن اب ایک اور روپ دھار بیٹھی ہے۔ پہلے تو یہ الجھن تھی کہ آخر کونسا مذہب برحق ہے اور اب یہ الجھن پیدا ہوئی کہ اسلام کے بے شمار فرقوں میں کونسا فرقہ حق پر ہے؟ ایک خدا اور ایک رسول ﷺ کے نام لیوا' اور اتنے فرقے اور اختلافات کہ ایک مخلص مسلمان کا ذہن سوچتے سوچتے چکرا جاتا ہے کہ آخر کونسے عالم کی تفسیر اور اسلام کی تشریح درست ہے۔ اگر سائنس' واقعات کے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم کر لے تو اسکا اتنا نقصان نہیں ہوتا لیکن ایک مسلمان کی دنیا و آخرت دین کے بارے میں غلط نظریات قائم کرنے سے برباد ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ان تفرقات اور ان اختلافات نے مجھے بہت پریشان کیا۔ اس کے علاوہ عالم جو دین کا ستون اور ملت اسلامیہ کو صحیح راہ پر گامزن کرنے کے اہل سمجھے جاتے ہیں ان کا آپس میں جھگڑنا' برا بھلا کہنا' نیتوں پر حملہ کرنا اور دوسرے کے خیالات کی غلط ترجمانی کرنا۔ سخت عجیب اور پریشان کن لگتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک عالم پر اتنا بھی اعتماد نہ ہو کہ وہ کسی کا نقطۂ نظر درست پیش کر سکتا ہے۔

علماء ایک دوسرے پر بے راہ روی کے فتوے لگاتے ہیں۔ گویا دین اسلام ان میں سے ہر ایک کی متروکہ جائداد ہے۔ اور وہ اپنا کلیم منظور کرانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور میری شرم کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میری ایک کمیونسٹ ہم جماعت ہمیشہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتی ہیں کہ تم مسلمان تو خود ہی اتنے فرقوں میں بٹے ہوئے ہو۔ کوئی اسلام کی تشریح کچھ کرتا ہے کوئی کچھ۔ آخر دنیا کے

سامنے تم کونسے فرقہ کے اسلام کو پیش کر سکتے ہو۔ اس وقت علماء پر بہت دکھ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ملت کو اتنے حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ مذہبی فرقوں، ملکی تعصب، نسلی تعصب، صوبائی تعصب، ذات پات کے تعصب میں بری طرح بٹ کر بے اتفاقی پیدا کر رہی ہے اور ہر کوئی خود کو دوسرے سے برتر سمجھ رہا ہے۔

کئی سال سے یہ خیالات میرے ذہن میں طوفان بپا کر رہے تھے۔ مجھے اس سوال کا جواب تو مل گیا کہ اسلام ہی دین حق ہے مگر یہ اب تک نہیں مل سکا کہ آخر کون سا فرقہ درست ہے؟ اگر میں کسی کے سامنے فرقہ بندی اور دوسرے تعصّبات کے خلاف بات کرتی ہوں تو کوئی میری بات کی تائید نہیں کرتا بلکہ اکثر یہی کہتے ہیں کہ اختلاف رائے بری چیز نہیں اور فرقے تو پیدا ہوتے ہی ہیں۔ مگر میں اب تک قائل نہیں ہوسکی کہ جب خدا نے سب کو ایک ملت قرار دیا ہے اور فرقہ بندی سے ہمیں ہر لحاظ سے نقصان پہنچ رہا ہے تو پھر یہ کیسے بری چیز نہیں۔

اتفاق سے پرویز صاحب کے لٹریچر میں مجھے پہلی بار فرقہ بندی کے خلاف اپنے خیالات کی تائید ملی اور میں نے شکر کیا کہ کوئی صاحب علم شخص تو اس فرقہ بندی سے نالاں ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ پرویز صاحب کے خیالات سو فیصدی درست ہیں یا سو فیصدی غلط۔ میں بہرحال یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میرے ذہن میں جو خیالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب انہی کی تحریر ہی سے ملتا ہے۔

اپنی اس الجھن کہ کون حق پر ہے اور کون غلط ہے کا جواب مجھے علماء کرام سے تو نہیں ملا کیونکہ ان میں سے ہر کوئی خود کو حق پر سمجھ کر دوسرے کو باطل پر قرار دیتا ہے۔ البتہ میری سوچ نے مجھے اتنی راہ ضرور دکھائی ہے کہ کسی عالم کو برا بھلا نہ کہوں اور نہ ہی مکمل طور پر اسے درست یا غلط سمجھوں بلکہ انہیں انسان سمجھوں جس سے لغزش کا قوی امکان ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پرویز صاحب ایسے عالم ہیں کہ اپنی رائے کو حرف آخر نہ سمجھ کر غور وفکر کا دروازہ کھلا رکھتے ہیں۔ کاش دوسرے عالم بھی اپنی رائے پر اصرار نہ کریں اور خود کو انسان سمجھیں۔ اب تو میں اس مقولہ پر عمل کرتی ہوں کہ ''یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے؟''

لیکن اس الجھن کا خاتمہ یوں نہیں ہوسکتا جب تک سب علماء آپس میں دوستی اور محبت کے ساتھ مسائل کو طے نہ کریں اس سلسلہ میں سب علمائے کرام سے چند گذارشات پر غور کرنے کی درخواست کرتی ہوں۔

۱۔ علماء کی سوسائٹی ملی جلی ہونی چاہئے یہ نہیں کہ ہر عالم اپنے اپنے مدح خوانوں کی محفل میں بیٹھ کر اپنے خیالات کو پختہ کرتے جائیں بلکہ انہیں مخالفین کی باتوں کو غیر جانبدار ہو کر سوچنا چاہئے۔ اختلافی موضوعات پر بجائے برا بھلا کہنے کے خلوص سے غور کرنا چاہئے اور ایک دوسرے کے خلاف جذبات رکھنے کی بری عادت کو ختم کر کے بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

۲۔ ہر عالم کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ اگر وہ کسی بھی غلط نظریہ کو پیش کریں گے تو اس کو قبول کرنے والے جتنے بھی

لوگ ہوں گے ان سب کا گناہ ان پر ہوگا۔ تعجب ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری ہو اور علماء اپنے نقطۂ نظر پر اس قدر اصرار کریں؟

۳۔ اختلافات کو ذاتی اختلاف نہ بنایا جائے۔ اپنے نظریات کی تائید کروانے کی بجائے حق کی تلاش کو اپنا مقصود حیات قرار دیں۔

۴۔ جو بات کسی دوسرے کی غلط محسوس ہو اس کو اخبارات اور رسائل میں کیچڑ اچھالنے کی بجائے اس شخص سے براہ راست گفتگو کی جائے اور طنز و تحقیر کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ کسی کے خیالات کی غلط ترجمانی کرنا بہت بڑا جھوٹ ہے۔ اور اکثر علماء دوسروں پر تہمتیں لگاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ عالم ہو کر اتنی بڑی غلطی؟

۵۔ اپنے ذہن کو حق کی قبولیت کے لئے بالکل کھلا رکھیں۔

۶۔ علماء ایک دوسرے کی تحریر و تقریر کا مطالعہ صاف دلی اور خلوص سے سمجھنے کی خاطر کریں۔ خامیاں تلاش کرنے کی خاطر نہ کریں۔ خود کو اپنے اپنے حامیوں کی محفل میں مقید نہ کرلیں۔

میری تمام علماء کرام سے نہایت ہی پرخلوص اور دردمندانہ التجا ہے کہ وہ ان پر ضرور غور کریں آپس کے جھگڑوں کو ختم کریں، بھائی چارہ قائم کریں، فرقوں کو ختم کریں، دیانت داری سے ہر مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کو تقسیم ہونے سے بچائیں اور سب سے بڑی یہ بات کہ مخلص مسلمانوں کو حق کی تلاش میں مدد دیں نہ کہ اپنے جھگڑوں کے باعث دین میں الجھنیں پیدا کریں۔ اگر علماء میری اس گذارش پر غور کریں تو ان کی بہت شکر گذار ہوں گی۔

''بنت اسلام''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین میں غلو

نبی اکرم ﷺ نے حجتہ الوداع میں جو عدیم النظیر خطبہ ارشاد فرمایا وہ درحقیقت عالمگیر انسانیت کے لئے منشور حیات ہے۔ اس میں' چند فقروں میں' اسلام کے بنیادی اصولوں کو اس حسن وخوبی سے سمٹا دیا گیا ہے' کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور وتدبر کرتی ہے' حقائق کی ایک دنیا اس کے سامنے بے نقاب ہوتی چلی جاتی ہے اس خطبہ میں ایک بلیغ فقرہ یہ بھی ہے۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غلو مت کرو۔ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئی ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ کیسی وسیع اور عظیم حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **یٰاھل الکتٰب لا تغلوا فی دینکم** (۴/۱۷۱)۔ ''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو مت کرو۔'' غلو کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ دین میں حد سے بڑھنے کی کئی راہیں ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ خطرناک راہ وہ ہے جس میں شخصیتوں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ چیز خود اس مقام سے واضح ہے جہاں یہ آیت آئی ہے۔ اس میں عیسائیوں سے کہا گیا ہے کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے مقام سے مت بڑھاؤ۔ وہ خدا کے رسول ہیں۔ انہیں خدا کا رسول ہی سمجھو۔ خدا یا ابن اللہ قرار نہ دو۔ یہ غلو فی الدین ہے۔

آپ مختلف مذاہب عالم پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی قوم اپنے بانی مذہب یا دیگر بزرگوں کی تنقیص نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں غلو کرتی ہے۔ انہیں ان کے مقام سے گھٹاتی نہیں' آگے لے جاتی ہے۔ ان کی مذمت نہیں کرتی۔ ان کی تعریف میں حد سے بڑھ جاتی ہے۔ ان سے نفرت یا عداوت نہیں برتتی' ان کی محبت اور عقیدت میں مبالغہ کرتی ہے اور یہی چیز ہے جو' نبی اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔

قرآن کریم نے' اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے جرائم کی فہرست میں (جن کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے تھے) اس جرم کو نمایاں حیثیت دی ہے کہ **اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔** (۹/۳۱) انہوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور پیران طریقت کو خدا سے ورے ہی اپنا رب بنالیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ اس آیت کے نزول پر حضورؐ سے عرض کیا گیا کہ ''یارسولؐ اللہ! یہ لوگ اپنے احبار و رہبان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے' اسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حرام سمجھ لیتے اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اسے حلال سمجھ لیتے''۔ اسی کا نام مذہبی پیشواؤں کو ان کے مقام سے آگے بڑھا کر خدا بنالینا ہے۔ حلال وحرام کے تعین کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ اختیار کسی انسان کو دے دینا' اسے خدائی اختیارات کا حامل قرار دے دینا ہے۔ یہ غلو فی الدین ہے اور قوموں کی ہلاکت کا باعث۔ اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ''انداداً من دون اللہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ **من الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً۔** وہ لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور ہستیوں کو بھی خدائی اختیارات اور اقتدارات کی مالک قرار دیتے ہیں''۔ اس کی تشریح اگلے الفاظ سے یہ کہہ کر کردی کہ **یحبونھم کحب اللہ۔** ''وہ ان کی محبت اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ سے محبت کرنی چاہئے۔ وہ اس محبت کا مظاہرہ ان کے ارشادات کی اطاعت سے کرتے ہیں یعنی وہ ان کے احکام کی اطاعت اسی طرح کرتے ہیں جس طرح خدا کے احکام کی اطاعت کرنی چاہئے۔ **والذین اٰمنوا اشد حبا للہ۔** (۲/۱۶۵) لیکن ایمان والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف احکام خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور شدومد سے اطاعت کرتے ہیں۔

یہ ہے دین میں غلو' جس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔

آیت (**یااھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم**..... الخ) کی تفسیر میں' تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ

> اہل کتاب کو زیادتی سے اور حد سے آگے بڑھ جانے سے اللہ تعالیٰ روک رہا ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں حد سے گذر گئے تھے اور نبوت سے بڑھا کر خدائی تک پہنچا رہے تھے۔ بجائے اطاعت کے عبادت کرنے لگتے تھےؒ بلکہ اور بزرگان دین کی نسبت بھی ان کا عقیدہ خراب ہو چکا تھا۔ وہ انہیں بھی جو عیسائی دین کے عالم اور عامل تھے' معصوم جاننے لگ گئے تھے اور یہ خیال کرلیا تھا کہ جو کچھ یہ ائمہ دین کہہ دیں اس کا ماننا ہمارے ذمے ضروری ہے۔ سچ اور جھوٹ۔ حق و باطل۔ ہدایت وضلالت کے پرکھنے کا کوئی حق ہمیں حاصل نہیں جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔ اتخذوا احبارھم..... الخ مسند احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰؑ ابن مریم کو بڑھایا۔ میں تو صرف ایک بندہ

ہوں۔ پس تم مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہنا۔ یہ حدیث بخاری وغیرہ میں بھی ہے۔ مسند کی اور حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے آپ سے کہا ''اے محمدؐ! اے ہمارے سردار اور سردار کے لڑکے۔ اے ہم سب سے بہتر اور بہتر کے لڑکے!'' تو آپ نے فرمایا۔ لوگو! اپنی بات کا خود خیال کر لیا کرو۔ تمہیں شیطان ادھر ادھر نہ کر دے۔ میں محمدؐ بن عبداللہ ہوں۔ میں خدا کا غلام اور اس کا رسول ہوں۔ قسم خدا کی میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھاؤ۔

حضورﷺ کو اس کی اہمیت کا کس قدر شدید احساس تھا' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ نے اپنی وفات سے قبل جن امور کی تاکید فرمائی' ان میں یہ بھی تھا کہ

> حرام وحلال کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

اور یہ بھی کہ

> یہود ونصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو پرستش گاہ بنا لیا۔

ان ارشادات نبویؐ کا مقصود یہ ہے کہ خدا کو خدا کے مقام پر رکھو۔ رسول کو رسول کے مقام پر اور بزرگوں کو ان کے اپنے مقام پر۔

جب قومیں اپنے بزرگوں کو ان کے مقام سے بڑھا دیتی ہیں' تو جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ جھگڑا کیا ہے؟ فقط یہ کہ مسلمان چاہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو ان کے صحیح مقام (عبداللہ ورسول اللہ) پر رکھا جائے لیکن عیسائی اسے حضرت عیسیٰؑ کی تنقیص اور توہین سمجھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنے کسی بزرگ کو اس کے مقام سے آگے بڑھا دیتی ہے تو جو شخص اسے اس کے صحیح مقام پر لانے کی کوشش کرتا ہے' اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس بزرگ کی توہین کر رہا ہے؟ اس سے مذہبی پیشوا عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیتے ہیں کہ یہ شخص تمہارے بزرگوں کی ہتک کر رہا ہے' حالانکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان بزرگوں کو ان کے صحیح مقام پر لاتا ہے۔ قوموں کی یہی نفسیات ہے جس سے وہ تباہ ہوتی ہیں۔ یعنی جب کوئی قوم اپنے مذہب کے بانی یا دیگر بزرگوں کے صحیح مقام کے متعلق سمجھنے لگے کہ وہ ان کی توہین کے مرادف ہے' وہ ضلالت کے جہنم میں گر کر تباہ ہو جاتی ہے۔

لیکن کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہم غیر مسلموں کے ساتھ تو آئے دن جھگڑتے رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بزرگان مذہب کو ان کے صحیح مقام سے آگے بڑھا رکھا ہے' لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ کیا ہم نے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ یہی کچھ نہیں کر رکھا؟ ہم جب انہیں کہتے ہیں کہ وہ اپنے انبیاءؑ اور بزرگان کو ان کے صحیح مقام پر رکھیں تو اسے حق کی تلقین اور دین کی خدمت قرار دیتے ہیں (اور یہ بات ہے بھی ٹھیک) لیکن جب یہی بات کوئی ہم سے کہتا ہے تو اسے

حق کا بدترین مخالف اور دین کا شدید ترین دشمن قرار دے کر اس سے سر پھٹول شروع کر دیتے ہیں! جب غیر مسلم اپنے بزرگوں کی بے جا عزت وتکریم کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہمیں ان سے شدید محبت ہے' اس لئے ہم اس باب میں کچھ نہیں سننا چاہتے' تو آپ اسے مذہبی دیوانگی (Fanaticism) قرار دیتے ہیں۔لیکن جب کوئی آپ سے کہتا ہے کہ آپ اپنے فلاں بزرگ کی شان میں اس قدر غلو کیوں کرتے ہیں تو آپ یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیتے ہیں کہ

مجھے معذور رکھ! میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہ ''مستی صہبائے محبت'' ہی تو ہے جسے قرآن کریم نے غلو فی الدین سے تعبیر کیا ہے اور جسے نبی اکرمؐ نے امتوں کی تباہی کا باعث بتایا ہے۔ یاد رکھئے! کوئی قوم نفرت اور عداوت کی بنا پر اپنے بزرگوں کی شان میں مبالغہ نہیں کرتی۔ وہ ایسا محبت اور عقیدت کی بنا پر ہی کرتی ہے۔سو اگر ان کا اس بنا پر ایسا کرنا غلط ہے تو اسی بنا پر ہمارا ایسا کرنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ وہ لوگ تو پھر بھی ایک حد تک قابل معافی ہیں کہ ان کے پاس کسی کے صحیح مقام کے تعین کے لئے خدا کی طرف سے کوئی معیار نہیں' لیکن ہمارا جرم اس باب میں بڑا سنگین ہے۔اس لئے کہ ہمارے پاس خدا کی وہ زندہ کتاب موجود ہے جو کائنات میں ہر شے کا صحیح صحیح مقام متعین کرتی ہے۔ قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ وہ ہر شئے کو اس کے حقیقی مقام پر رکھتی ہے۔کسی شے کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا دینے کو (امام راغب کے قول کے مطابق) ظلم کہتے ہیں۔ قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہی اس لئے ہے کہ اس میں غیر خدائی ہستیوں کو ان کے مقام سے ہٹا کر آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔(**ان الشرک لظلم عظیم** ۔۳۱/۱۴)۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ان کے صحیح مقام سے ہٹا کر' بہت آگے بڑھا رکھا ہے۔ جب کوئی شخص دوسرے لوگوں کے ان معبودوں'' کے متعلق کہتا ہے کہ انہیں ان کے صحیح مقام پر رکھنا چاہئے' آپ خوش ہوتے ہیں اور اسے دین کا سچا خادم قرار دیتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کے ''معبود'' کی باری آتی ہے' آپ بھی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

نبی اکرمؐ کے ارشاد گرامی کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے کہ

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غلو مت کرو۔تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئی ہیں۔

جس طرح پہلی قومیں' دین میں غلو کرنے سے تباہ ہوئی تھیں' ہماری تباہی کا بھی ایک بنیادی سبب یہی ہے۔اگر ہم اپنے اس غلو کو اپنی محبت۔عقیدت۔ارادت۔اور بزرگوں کی علو مرتبت اور رفعت عظمت' سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیں کہ یہ غلو نہیں' تو اس سے ہم اس کے نتائج سے نہیں بچ سکتے۔ ماں اپنے بچے کو کتنی ہی محبت سے' دوائی کی جگہ (غلطی سے) سنکھیا دے دے'' سنکھیا اپنا مہلک اثر کر کے رہے گا۔ ہم اس تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ جب تک ہم ہر واجب

الاحترام ہستی کو اس مقام پر نہ رکھیں جو مقام اسکے لئے خدا کی کتاب نے تجویز کیا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں ہمارا کوئی محبوب بزرگ اس مقام سے نیچے آجاتا ہے جو ہماری عقیدت مندی نے اسے عطا کر رکھا ہے' تو اسے اس بزرگ کی توہین نہ سمجھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسا کرنا ہم پر بڑا گراں گذرتا ہے' اس لئے کہ عقیدت کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے' اور جذبات کا بدلنا' بڑی ہمت چاہتا ہے۔ لیکن قرآن پر ایمان کے تو معنی یہ ہیں کہ جب ہمارے کسی جذبہ اور قرآن کی تعلیم میں کشمکش ہو (ان میں Tie پڑ جائے) تو ہم اپنے جذبہ کو قرآنی تعلیم کے تابع لے آئیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو قرآن پر ہمارے ایمان کے کچھ معنی نہیں۔ ایسا کرنے سے' نہ صرف یہ کہ آپ دین کے صحیح راستے پر چلیں گے' بلکہ آپ کے وہ بزرگ بھی آپ سے خوش ہوں گے۔

اس لئے کہ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس امر کی تصریح کی ہے کہ جن بزرگوں کو تم نے' ان کے مقام سے آگے بڑھا رکھا ہے' وہ قیامت میں تمہارے دشمن ہوں گے اور تمہاری اس بے جا عقیدت مندی سے اظہار برأت کریں گے۔

آپ سوچئے کہ اس قسم کی عقیدت وارادت جو خدا کے حکم کے خلاف۔ رسول اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے خلاف اور خود ان بزرگوں کی طرف سے ہمارے لئے عداوت اور بیزاری کا موجب ہو' ہمارے لئے موجب تباہی نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن

برا ہمی نظر پیدا بڑی مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

ECONOMIC LIBERALISATION

By

Saima Hameed, UK.

****

"Liberalisation" is an economic term that became increasingly associated with the "Washington Consensus", in which the IMF, The World Bank and the US treasury made an agreement that if they were going to give loans to a country, which they termed as "aid", then, the country would have to adopt policies, which economists from IMF and World Bank *believed* would have a positive impact on growth. These policies increasingly relied on "laissez- faire" and openness, where there is an exposure of the domestic goods market to the international economy, a reduction in tariffs of imports, a devaluation of the local currency and a switch from import substituting to exportable goods and commodities. There was also to be a reduction in the budget deficit. Moreover, **economic liberalisation** implies the minimal role of the government, in the domestic financial, commodity, and labour markets as well as privatisation of public assets. Hence, the policy package relies on a pro-private sector economy in which market forces would determine such economic variables as the interest rates, including the provision of public goods; inflation would be reduced and there would be sustained economic growth.

The IMF and The World Bank put increasingly, stringent conditions in the 1990s on countries that wanted external assistance and these had increased from **27 to fifty six in 1989**. The loans made available has involved several adjustments in policies regarding:

1. Improving the balance of payments position
2. Cutting the fiscal deficit
3. Lowering inflation
4. Increasing growth

However, before I go to discuss how these four factors had an impact on economic growth and how the governments of Pakistan dealt with them, it would be useful to say that historical, political, social, legal and external factors and the legacy of

Zia had an important impact on the success of the programmes by the successive governments of Sharif and Bhutto. Both Prime Ministers seemed to understand the logics behind the market sector and the increased efficiency it brought- and both Prime Ministers started the program of privatisation and deregulation. However, economic problems were exasperated by governance problems that had been created when there was a legacy of distrust and superstition between "the leading party" and "opposition", rather than a new era of trust and cooperation. The situation was frustrated by a lack of "political ideology" in the PPP and the IJI - inevitably, this lead to low public confidence. The economic situation had also been adversely affected by "urban bias", and sectarian conflicts through the Zia regimes encouraged Sunni organisation, "Sipah Salar Pakistan" and the reactionary Shia organisation, "Sipah-e-Mohammad Pakistan" and also the events in Karachi. In the 1980's, some 3.5 million Afghan refugees had come to Pakistan, and brought with them the guns and drugs culture. It was at the backdrop of this and the Gulf War in September 1990 when oil prices rose from $16.4 per barrel to $30 per barrel, that Finance Minister Mehboob-ul-Haq, rightly called the economy "bankrupt" while presenting the 88-89 budget and highlighting the problems that would occur if Pakistan's government continued to address its "long term structural problems".

Not only this, Benazir Bhuttos's ability to rule with full authority had been compromised when she inherited an economy in which a major "structural adjustment loan" had already been drafted and agreed to, between the interim Prime Minister, Mazari and the IMF representatives. Analysts have ascertained that "Benazir's selection as Prime Minister was preconditioned, among other things on the ratification of the programme". Macroeconomic **imbalances** were large and the fiscal deficit had reached 8.5% of GDP and the current account balance of payments deficit was growing. Unfortunately, investment in infrastructure and human resource development had been **sidelined** and seriously **restrained future export growth**. Savings had also been excessively low, compared to other countries as India and China. This then was the legacy left by Zia.

While in average developing countries in 1995 saved around 30%, Pakistan only saved 17% compared to 22% by India and 42% by China. However, despites these low savings, investment was high at 19%. The gap between investment and savings was financed by short-term borrowings, often at high interest rates from the "market". Pakistan also borrowed from the IMF and the World Bank in 1988, which was a program running till 1991, and then in 1993-1994 by the interim government of Moeen Qureshi, prior to Benazir's second term in office as Prime Minister, which further constrained her economic independence.

Pakistan had to borrow at high interest rates also because in 1990 President George Bush refused to certify that Pakistan was not in violation of the "Pressler agreement", in which a country had to give assurance it did not possess nuclear

weapons. Perhaps with the fall of USSR, and the withdrawal of its troops from Afghanistan, and collapse of communism, America no longer needed Pakistan's assistance as a front line state. However, the fact that the US in 1990 stopped implementing the promised program of 1987 in which $4.02 Billion of military assistance was promised had a serious impact on growth - as Pakistan's governments were developing a psyche of relying on foreign aid - this was displaying its negative effects when saving rates remained low, despite **foreign assistance** increasing to $21 in 1989-1990 - the highest level of foreign assistance in Pakistan's history!

Under the IMF programme, major changes were to take place in **trade policy**, the **fiscal policy**, and **financial sector,** which as stated were aimed at cutting the budget and trade deficit so that inflation could be reduced and growth enhanced - and which where the conditional ties for attaining aid.

Fiscal Policy

Hence in the 1988 program with the IMF, Pakistan was to cut the budget deficit from 6.5% of GDP in 1988-1989 to 5.5% in 1989/1990 and then to 4.8% in 1990-1991. By decreasing public expenditure and increasing tax revenues, it was hoped to increase the revenue raising ability of the government. Subsidies on fertilisers and to the agricultural and energy sector were to be decreased. It was hoped that imposing the sales tax would increase revenue by the end of the three-year program and "revenue/GDP" would be increased from 17.6% to 20% by 1991/92. Government expenditure was to be reduced from 26.2% of GDP to 24.8% in the three-year period.

Trade Policy

In order to improve the competitiveness of the goods produced in the economy, the exchange rate was to be devalued. While encouraging exports however, all quantitative restrictions on imports i.e. quotas and sanctions were to be lifted. Hence instead of distorting the price mechanism by protectionism and import substitution, export orientation was to be encouraged. There was to be a decrease in all banned commodities from 400 to 80 and the maximum tariff was to be lowered from 125% to 100% in 1990. The aim was to make imports cheaper and encourage the private sector in the export of even rice and cotton. Hence import and licences were abolished and cotton, manufactured products, sports goods and non-manufactured good's export was increased. The trade deficit was to be reduced from 3.4% in 1988/89 to 2.8% in 1989/90 and then to 2.6% in 1990/1991.

The Financial Sector

By allowing the interest rates to be determined by the market mechanism i.e. the banks were to become more prudent, autonomous, profitable efficient and by tightening the supervision over them, debt recovery was to be strengthened. There was an attempt to increase banks own capital resources, create "credit information bureau"

with the State Bank and allow the private sector access to priority areas. On the monetary side, policies were to be undertaken to abolish negative real interest rates on credit programmes and freeing the interest rate for medium and long-term credits. Hence, eliminating official setting of share prices

In addition to the above, the macroeconomic adjustment through liberalisation was hoped to

1 Reduce the inflation from 10% to 6.5 % in 1991.

2 Reduce the civilian debt ratio

3 Increase the foreign exchange reserves

4 Contain the growth of domestic credit and money supply in line with nominal GDP at target inflation

5 And sustain the GDP from 5.2 in 1989 to 5.5 in 1989-1991.

On a large scale unprofitable enterprises were to be closed in order to reduce the government's fiscal burden and were to be sold to the private sector. Whilst Pakistan previously suffered from urban bias, agricultural prices were to be liberalised and subsidies to farmers were to be discontinued.

The Impact of Liberalisation and Structural Adjustment

In the 1990's then liberalisation meant that the encouragement of private investment and import licensing- regulatory restrictions like registering foreign loan agreements and procedures for employing foreign workers were abolished. Areas as power generation, commercial and investment banking, air and sea transport were opened to the private sector. One hundred and five manufactured units were put up for privatisation and by November 1992 sixty-seven units were sold and there were steps to privatise telecommunications and the gas sectors. Industrial activity grew by over 6.3%.

In the **financial sector**, resident Pakistanis were allowed to operate foreign currency deposit, and interest rates on the deposits were allowed to go up. Domestic saving increased from 10.5% to 12.5 %, as overseas Pakistanis deposited foreign currency in the domestic banking sector. Two state owned banks, Muslim Commercial Bank and Allied Bank Limited were sold to the private sector. Ten private sector banks and eight investment banks opened, while in the stock market, activity was increased due to domestic and foreign investments. Whilst treasury bills increased to 13%, rates of return on concessionary lending schemes increased to remove the negative interest rates. As interest rates rose, bank deposits and hence saving increased and there was a narrowing of credentials among various financial instruments.

On the fiscal front, over 121 commodities remained exempt from the **"general**

sales tax", and the duty rate for imports was reduced from 225% to 90% in 1992. Loopholes in the tax system such as exemption and corruption and the hand of vested interests meant that agriculture remained untaxed, even though 25% of GDP is contributed to by the agricultural sector. Mostly, large feudal landlords benefited from this at the cost of the country and in the 1990's out of 130 million only 800, 000 individuals paid tax. Hence the government was unable to extend the taxation structure and make it more equitable and progressive. The increasing fiscal deficits meant that the loans acquired were just used to finance the revenue gap so that painful repercussions on employment, wages and inequality could be extended. Energy prices increased in average of 4% in real terms and sizeable revenue was earned from excise duty. The revenue from trade taxes declined from 5.9% of GDP to 5.1% of GDP in 1991. Hence, the contradictory policy between increasing taxes and reducing tariffs manifested itself in the economy, and the burden of external debt increased from 44% to 46.5%.

Although **trade liberalisation** did decline the **trade deficit** from -6.6% to -4.6% of GDP, trade liberalisation encourage mainly encouraged imports. Foreign exchange inflows increased by US $1.2Billion, gross external reserves also increased due to private capital inflows into foreign currency deposits and there was an increase in foreign investment.

Unfortunately, agriculture suffered adversely in the 1990's. In 1991/93, there was high output in cotton, wheat, and rice and grain - so much so that with an output of 1.8 million tons of cotton, Pakistan was among the largest cotton producers of the world. By the beginning of 1990 Pakistan had become a sizeable exporter of rice i.e. 1.5 million ton in 1990. However from 1991-1992 to 1996-1997 Pakistan's production of wheat increased only modestly at a rate of growth of 1.3% and Pakistan had to resort to importing food grains! By the winter of 1998, Pakistan was looking for foreign exchange to pay for imports of rice and wheat - even cash crops as cotton also saw a decrease in output. It was evident that in the 1990's, the government had been unsuccessful in maintaining the rich irrigation network and it failed to protect the farmers from harmful chemicals bought in the public and private sector and failed to supply the farmers with high quality seeds and pesticides. Subsequently, in the late 1990's cotton had to be imported to keep the spinning mills open. Corruption and poor governance had taken its toll so much so that the country's need for even the basic needs depended on foreign imports.

While Benazir lost an opportunity for herself when she started placing financial institutions in the hands of the public sector rather slowly, Nawaz Sharif's government in 1990 immediately set up a "privatisation commission", and started privatising a large number of cement industries, banks and their were plans to privatise the "Water and Power Development Authority" (WAPDA) and the KESC. The forceful push in Sharif's privatisation program also came by the deregulation and privatisation in

highways construction, airlines, shipping and the relaxation on private sector controls. There was an encouragement of foreign equity investment by allowing investors to own up to 100% of equity in a company and access to foreign borrowing was liberalised for foreign and domestic investors, especially when no government guarantee was involved. The "privatisation commission" had identified 115 industrial units for Privatisation and by 1993 sixty-four were privatised with plans to privatise a further four by 1995.

Although industrial activity began to pick up, "Ittefaq Group" owned by Sharif's family defaulted on their loans. "The yellow cab scheme" and the private sector involvement in the development of roads such as that from Lahore to Islamabad was a drain on scarce public resources in which the former cost the economy $600million worth of imported cars! The vigilant press also reported that some privatised units had been handed over to Sharif's friends on very favourable terms. Evidently, the President stepped in to dismiss the Prime Minister on grounds of corruption and mismanagement. The increase in the fiscal deficit was thus accompanied by a **worsening** in the effectiveness of public spending and the increasing bypassing of the Planning Commission in the approving process where low priority projects were included in the development program.

Benazir's second tenure saw that by November 1996, most public firms in the service sector were either bankrupt or close to insolvency - the number of people employed exceeded the requirement with many "ghost workers" who just received their cheques and did not contribute to the effectiveness of these companies. The KESC in the summer of 1998, unable to service its debt and pay for its fuel was about to shut down. For companies such as these the government had to pay 12% of GDP to prevent them from defaulting. Increasingly political intervention in state owned commercial banks increased the bad debts of the system. The State Bank of Pakistan also began to incur large losses on account of guarantees given to the holders of foreign exchange deposits. In 1994 the government successfully sold vouchers to the general public and foreign investors, entitling them to shares of newly independent company, "Pakistan Telecommunication Corporation" which by 1996 entitled them to 26% equity. In 1994/95 plans to privatise WAPDA lead to the sale of Kot Adu, Janshero thermal power plants, the Faisalabad Area Electricity Board, the Sui Northern and Sui Southern public gas companies. This generated Rs. 38 Billion. However, instead of being used to return public debt, the proceeds were used for unsustainable level of public expenditure and current account balance of payments deficits.

Savings and investment may have also been **adversely affected** by Pakistan's nuclear tests in 1998, which decreased Pakistan's credit worthiness and saw the imposition of economic **sanctions** on Pakistan's goods so that exports suffered adversely. In reaction along with devaluing the economy, the government imposed controls on capital movement and **froze foreign currency accounts** - this hurt the

expatriate community that had assisted in the development of the country since the seventies. However, some revenue was also earned from the software industry from the help of the expatriate community and by the late 1990's policy makers realised that their country had missed a great opportunity in failing to **mobilise the human resources** to develop an export orientated service sector and software industry.

Political and macroeconomic instability by the late 1990s and the increased openness of the economy contributed to the financial crisis, and sidelined the progress made in the economy due to liberalisation and its associated increase in economic activity. The table below shows the per capita GNP.

	GDP		Population increase	
	1980-19990	1990-1997	1980-1990	1990-97
Pakistan	6.3	4.4	3.1	2.9
India	5.8	5.9	2.1	1.8
Bangladesh	4.5	4.5	2.4	1.6
Low Y Countries	4.3	4.2	2.4	2.1

It can be concluded that per capita GNP growth in during 1988-96 was only 1.2% per annum as population growth rate remained close to 3% per annum. In the eve of Pakistan's fiftieth anniversary, Pakistan was one of the most heavily indebted countries of the world! The total amount of debt exceeded the GDP and (2/5) % of all export earnings went into the servicing of external debt. Domestic public debt had increased from RS. 290 billion in mid 1988 to an estimated RS 909 billion by mid 1996, simultaneously, external debt doubled to US $ 25 billion by mid 1996. The interest payment on public debt had increased to 6.1% of GDP.

Pakistan's worst performers among other south Asian countries in the 1990's had adverse social consequences on the employment, distribution of income, and wages. While rent seeking through preferential access to credit concentrated wealth in a few hands, high inflation hurt people on low incomes and those in fixed incomes, such as public servants. Real wages tended to decline everywhere except the rural areas of the Punjab and there was a redistribution of wealth in favour of agricultural producers and landlords who held large tracts of land, at the cost of urban consumers as export duties on cash- crops was phased out and there was no agricultural tax.

The IMF agreement of 1993 1994 and 1999 with Pakistan's government saw that similar policies were imposed as in 1988 and the adverse consequences were becoming clearer. Out of the four policy aims listed at the start of the page, only the GDP had taken the desired path and was close to 5.5 %. The budget deficit the current account deficit and the inflation rate were way of the target. Taking the average performance of Pakistan in the 1990s, GDP was even less than 4.4%. Studies by

Shahrukh Rafi Khan, Asad Sayeed and Aisha Ghaus point to the disastrous social consequences of high inflation and cuts in government expenditure on the poor. The latter two writers have found that following the IMF programmes of 1997/98 there was not only a low GDP growth but also that distribution of income worsened, there was a decrease in employment and lower real wages meant that **poverty had became widespread**. Liberalisation had clearly been unsuccessful. The results can allow one to conclude two things:

1 Either the liberalisation failed as it has not been implemented properly in Pakistan

2 Or that liberalisation **cannot** be successful in a country like Pakistan.

It is useful at this point to look at the purpose behind the creation of Pakistan and its history. In creating Pakistan Jinnah had said,

> "If we take our inspiration and guidance from the Holy Quran, the final victory I once again say will be ours" {30 October 1947}.

According to the Quranic ideology, Pakistan was never meant to be a "laissez faire" economy because the Quran gives a social order termed "Rabubiyyat", according to which the Islamic State, for the justification of its every existence, has to make itself responsible for the development of every citizen. The Quran puts forth the relationship between the individual and the state in the following verse,

> "Allah has bought from the believers their lives and what they have of material things so that He may give them Jannah (prosperity in this world and the hereafter)".

Hence, according to this contract, the individual offers obedience to the laws of God and follows the economic laws of the state (which acts as an agency for the implementation of Gods laws). Hence he gives away everything that is more than his "**needs"** to the state, which then makes itself responsible for society's development**.** At another point, the Quran makes this point explicit when it says,

> "What is it that they should give away? Say thou, the surplus" (2:219)

The Quran denounces the self-seeking tendencies of the individual used in the market economy and using the personification of gold and wealth says,

"Those who hoard gold and silver and spend it not for the cause set forth by Allah, unto them give tidings to a painful doom, on the day when it will be heated in the fire of Jahannum, and their foreheads and their flanks and their backs will be branded therewith (and it will be said) Here is that which you hoarded for yourselves - now taste of what you used to hoard. (9:34-35). The desire to hoard, results in exploitation of the poor, misery and mutual superstition, just what happened to the economy in the 1990s, as a result of liberalisation.

Reference to verse 80:24-32 and Iqbal's poem points to the fact that most of the input in producing food is in fact Gods - the water, the soil and these provide for man; hence, just like other creatures in the world, man must take what he needs and keep the rest open for the nourishment of others. In (28:78), the Quran through the example of Korah tries to tell man that he commits a grave mistake when he believes that he owes his wealth exclusively to his own effort.

Hence the belief in private ownership and reduction in the role of the state are contradictory concepts which the Quran cannot reconcile as they depend upon exploitation, inequality, and degradation of resources, lack of investment in public infrastructure and no restriction on the amount of wealth that an individual might amass. The wave of liberalisation in the 1990s have shown that income inequality acts as a function of growth and it is the most disadvantaged groups that suffer in the long run while a few, according to Mehboob-ul-Haq, it is the 22 families which have benefited from economic growth in Pakistan, are made richer. According to the Quran then, such a system cannot be sustainable in the long run until it addresses the key issues raised in the Quran.

****

FREEDOM OF THE OPPRESSED

By
A.S.K. JOOMMAL
(Editor: Al-Balaagh, Lenasia, South Africa)

****

(How the Holy Prophet (S) solved the political problems of the oppressed with the divine ideology of Islam).

- ALLAH DOES NOT CHANGE THE CONDITIONS (PROBLEMS) OF A PEOPLE UNTIL THEY THEMSELVES BEGIN TO CHANGE WHAT IS (NEGATIVE) IN THEMSELVES. (13:11)
- ALLAH GUIDES NOT EVIL-LIVING PEOPLE. (61:5)
- EVIL-DOERS ARE DESTINED TO FAIL IN THEIR PLOTTING (MISSION). (35:10)
- WRONGDOERS WILL NOT BE SUCCESSFUL (IN THEIR STRUGGLES). (28:37)
- ALLAH LOVES THOSE BELIEVERS WHO DO GOOD DEEDS. (3:148)
- SUCCESS WILL COME TO THE BELIEVERS (IN THEIR STRUGGLES). (18:1; 24:55)
- ALLAH IS WITH THE BELIEVERS IN THEIR FIGHT AGAINST THE EVIL ONES. (3:120)

==========

The seven verses quoted above are from among scores of others in the same vein which appear in the Holy Quran, summing up the formula for success or failure mapped out for BELIEVERS IN ISLAM who are engaged in any struggle against oppressive or tyrannical situations or conditions.

If we look at Islamic history during the time of the Holy Prophet (S) in the 7th Century, we discover that a fascist, tyrannical Quraish regime was ruling Makkah, perpetrating the worst kind of crimes against humanity.

The poorer and lesser tribes were brutally oppressed by the stronger and bigger capitalistic clan. Slavery was rife. Blacks kidnapped by pagan slave-traders and sold to rich merchants, became nothing less than beasts of burden with NO recognition as human beings with souls.

The corrupt Quraish clan ruling Makkah at the time indulged in evil deeds that defy description. They were committing rape, sodomy, fornication, adultery, mob violence, plunder, gambling, idol and ancestor-worship—you name it, and they were

doing it!

This whole spectrum of evil, however, did not rest with the oppressors alone. It was the way of life of the oppressed as well!

CRUX

And here lay the crux of the problem when the Holy Prophet (S) came along to free the oppressed from the oppressor. Under Divine guidance, the Prophet(S) was informed that God would NOT deliver a people whose way of life was steeped in evil—even if they were oppressed and suffering.

The rules were clear. And they were Divine rules, not man-made ones! The oppressed masses HAD FIRST TO BE TAUGHT TO CHANGE WHAT WAS NEGATIVE IN THEMSELVES IF ALLAH WAS TO CHANGE THEIR CONDITION! (13:11).

The Prophet (S) was told that it would be an exercise in futulity to free the oppressed, evil-living people. Past history had shown that when the tables were turned, the oppressed then became the oppressors, perpetrating the same crimes of the former rulers.

INCORRUPTIBLE

The society that Allah wanted was a God-conscious one where total honesty, justice, love, kindness and piety would be the order of the day!

When the evil oppressors were overthrown, the new government had to be run by people who were incorruptibe, unbribable, and truly JUST in everything they did.

Their action had to rest in a fear of Allah and Allah alone—a fear to do wrong (thus displeasing Allah) and an overwhelming love for humanity.

The Quran laid down all the rules and requirements for this type of government and society.

After 23 years of teaching Quranic ideology to oppressor and oppressed alike, the Holy Prophet (S) eventually built up an army of clean-living, upright followers who were finally drawn into an armed clash with the evil rulers who refused to accept the Prophet's exhortations that they change.

And as Allah promised the now rightly-guided oppressed, victory after victory became theirs until falsehood and evil were eradicated!

The Prophet (S) set up his government based on Allah's Laws enunciated in the Quran, with his cabinet consisting of nothing less than the "Best in conduct and justice".

TROUBLE-FREE

And as long as ruler and subject abided strictly by moral and ethical standards

of the Quran, basing all their political, social and economic requirements on it, a trouble-free society ran its natural course in line with the immutable universal laws of Cause and Effect. Good causes resulted in good effects.

It was only later, after the Prophet (S) had passed away, that subsequent politicians and leaders began to deviate from the teachings of the Quran out of sheer hankering after power and greed for wealth. This led to the break-up of the ideal Islamic State, leading once again to strife, disunity and conflict.

Thus we learn from Islamic history and the Quran that the removal of MENTAL POLLUTION in the form of GREED, LUST, DECEIT, BACK-BITING, BACK-STABBING, IMMORALITY and the like is a PRE-REQUISITE for esablishing an ideal society with peace, harmony, justice, love, and mental equanimity.

FREEDOM

The moral in this short sketch is that ALL Muslims—irrespective of race—who wish to bring about an ideal Islamic society akin to the era of the Holy Prophet (S), MUST embark upon an Islamic PROPAGATION mission to CHANGE the life-style of the oppressed nations FIRST before they can hope for Allah's help to FREE the people. And the change must come through the strict adherence to the Quranic teachings!

Long, interminable du'as on "big" nights, on Fridays, invoking Allah's help through the Du'a-e-Qunoot, and other multifarious du'as begging Allah to destroy the enemies, JUST DO NOT HELP! Remember how many throat-drying du'as we made to Allah since 1948 for Him to annihilate Israel and give victory to Muslims? Did the du'as help? Victory after victory was enjoyed by the Jews—and they are STILL victorious—and the Arabs are subservient to, and subjugated and humiliated by, the Yahoodis! If we have *any* brains, then let us work out WHY Allah does not want to accept our so-called "du'as"!!

What must be borne foremost in a Muslim's mind is that the priority to total physical freedom is the need, initially, to attain total (moral) freedom in terms of a MENTAL STATE immersed in total GOD-CONSCIOUSNESS (Tawqa). This is a Divine Law. All other ways—especially the VIOLENT ways!—that come through man's FAULTY reasoning, end only in disillusionment, frustration and chaos. We may look at the world around us today to see this fact. Neither Capitalism, Communism, Marxism, or any other –ism has ever succeeded in freeing man totally, as Islam had done in the time of the Holy Prophet (S).

TRUE FREEDOM CAN ONLY COME FROM STUDYING AND UNDERSTANDING THE HOLY QURAN… AND THEN PRACTISING IT!!!

****

FAMILY PLANNING

By
(G.A. Parwez[R])
English Rendering By
Dr. Manzoorul Haque

==========

After atomic explosion, the biggest problem that gained attention of the entire comity of nations is the issue of Birth Control. Previously the means, methods and medicines used for Birth Control were a subject of individual interest only. In those days, the contraceptives -means, devices and tools -were generally used to prevent illegal sexual relations that coincide to pregnancy. There is also no doubt that these preventive measures were also used for legal purposes under some compelling circumstances –such as the ill health of the wife. But the general use of these devices was only to ward off the consequences of the unfair cohabitation. Now this issue has taken a new turn. It has, gradually attained a collective stride, with mounting significance.

The population in the world is increasing alarmingly. It is said this increase of population is not proportional to the rate of production. Nor is it possible to increase the resources of production either gradually or emergently. It is feared if this state of affairs is allowed to continue, the world will starve to death. So the dominant thought to overcome this trouble is to devise means that may restrict this alarming growth of population. This is called Family Planning. In other words it means the number of children in a family may be restricted to suit the rate of production. As a measure of national expediency, the comity of nations is pondering over this issue in terms of the political, economic and health implications. But as a Muslim nation, we have to think from a different perspective, regardless of the measures the other nations adopt. Now the point is: 'What is its position in Islam?'

We have two schools of thought. One faction says the Birth Control is lawful, while the second says it is absolutely unlawful – and unlawful to the extent that

> 'Had such a motion been moved at the time of Hazrat Muhammad (pbuh), he (pbuh) would have deterred it with curse, and had called for Jihad against it, as he (pbuh) had done against polytheism, paganism, and idolatry.'

The outfit that favours the lawfulness of Birth Control, presents those Ahadith, which make it clear that the Nabi (pbuh) had permitted az'l for this purpose. **(Az'l means 'to cohabit without ejecting semen into the female reproductive tract'.)** The second faction though does not refute the sanctity of these Ahadith, says that

> 'The reality of the few traditions narrating the permission of az'l is that a person stated his personal circumstances or compulsions. The Messenger (pbuh) kept them in view, and responded just cursorily. If any justification of az'l is inferred from these responses present in the traditions ascribed to the Messenger (pbuh), even then it cannot be said that these can be applied for the favour of the general move of Birth Control. This

general move is hemmed in a formal pure materialistic and permission-oriented philosophy as a discipline only.'

Projecting the authenticity of the lawfulness or unlawfulness of Birth Control from the az'l-related traditions is basically wrong. The reason is that these traditions make it crystal clear that their ascribing to the noble personality of the Nabi (pbuh) can not be right in any sense. Regarding az'l, one of the traditions of Bukhari is:

> Hazrat Abu Saeed Khazri narrates: Once sitting in the company of the Messenger (pbuh), a person (Majdi bin Umar-o-Zamri) said, " O Rasool Allah! We copulate with the imprisoned women in the battle. Since we want to sell them, so what is your (pbuh) opinion regarding az'l?" The Messenger (pbuh) said, "Do you do so? You have no compulsion, if you do not do so. It is because the being whom Allah has destined to take birth (in the world) would definitely be born".
>
> *(Hadith No. 789, Bukhari, Vol. 2, Amjad Academy, Lahore, Pakistan, P.428)*

Another tradition is:

> Ibn Muheeraiz said: I saw Abu Saeed Khazri and asked him about the issue of az'l. He said, 'In Ghazwa Bani Mustalaq, we accompanied Nabi (pbuh) and a few prisoners of Arabia came with us. Then we felt desire for the women and the celibate life overpowered us. We wanted to do az'l. Then we asked the Messenger (pbuh) of Allah." He (pbuh) said, "You can do az'l. There is no abuse. Whosoever is to born till to the day of Judgement, will definitely be given birth to."
>
> *(Hadith No.1074, Bukhari, Vol. 2, Amjad Academy, Lahore, Pakistan, P.618)*

These traditions do neither require any criticism, or any justification for their proof to be false and fabricated. From our point of view, these cannot be ascribed to the Messenger (pbuh). It means these are not the true Ahadith of the Messenger (pbuh). Moreover, these traditions do not make it clear as to what the Messenger (pbuh) had answered to the question.

The nature of the arguments and objections that the religionists raise against the Birth Control is:

1. It keeps the doors of fornication/adultery wide-open, i.e. it promotes fornication openly.
2. It is progeny killing, and is the most horrendous crime in Islam.
3. Killing of children under the fear of hunger is nugatory to the belief that "Allah is the Nourisher".

Before exposing what the Qura'n says about Birth Control, a brief critique of the above mentioned objections is necessary.

The first objection is that it keeps the doors of fornication wide open. First look to the nature of this objection: This objection is not against Birth Control. It is against those measures and devices that are generally adopted for this purpose. Now the question is 'if a person adopts these measures and wards off fornication, how will the mode of this operation be understood from the Islamic point of view?' If this mode is legal, there ought to be no objection against Birth Control. The objection ought to be against those devices and measures, which cause concern for the spread of fornication. If Birth Control is lawful, and under the compelling circumstances of the country it is indispensable, then it should be thought out that:

1. Only the measures not promoting fornication are adopted.
2. And if, at present, such measures cannot be made available to the people, then only those devices, which the people can not use illegally, are adopted.

The argument that 'the-people-will-make-use-of-unfair-means-so-the-genuine-purpose-of-birth-control-be-abolished-all-together' carries no weight. Hence it warrants no need of any elaboration for the intellect class of people. By the way, this paradox is just the same, that says since the people travel without ticket, so the trains be discontinued. Or since the women commit suicide by igniting the sprayed kerosene oil over their dress, so the use of kerosene oil be strictly prohibited. Even it is better to say that the use of the matchstick be prohibited too. Or since the knife-crimes are occurring frequently in the country, so the manufacturing of the knives be stopped. This mode of reasoning can still be extended further and it can be vehemently said: since the presence of woman is the source of fornication, so all the women be exiled to keep the fornication closed for ever.

As mentioned above, if the Birth Control is not unlawful in itself, then the phenomenon worth to be considered would be: "What means should be adopted for this purpose? And which options be exercised that do not fall in the purview of wrong dispensations?" We'll discuss this point later on.

The second objection is that it is "killing of the progeny". In other words it means if sexual intercourse is done and the women are not allowed to become pregnant, then this amounts to "killing of the progeny". This is extremely a weak objection. Firstly, how can a child be killed when it has not yet come into being? If it is said: 'the human's semen has the potential of becoming a child; if the process of pregnancy is prevented, the child will never come to existence, so it is "killing of the progeny". The feebleness of this argument is self-evident. The following examples will make it clear:

1. If a human, despite attaining the age of marriage, does not get married, or enters into the wed-lock late, he ought to have committed "killing of the progeny". It is because, with this action, he has prevented the birth of so many children.
2. There are tens of thousands of life-creating ***"sperms"*** in a single drop of semen. Every ***"sperm"*** has the potential to develop into a child. It is not necessary that each intercourse may definitely prod to pregnancy. It means every intercourse "kills tens of thousands of children". And when pregnancy occurs, out of the tens of thousands of ***"sperms"*** it takes only one (or maximally two) to develop into a child. The rest of the ***"sperms"*** go waste. These ***"sperms"*** ought to be considered as the "killing of progeny". Likewise, if intercourse is done after establishing the pregnancy, the entire cluster of ***"sperms"*** go waste. What of it!
3. If any one, the husband or the wife, is barren, all the life-creating ***"gametes"*** of the counter part go waste. Will it all be counted "killing of progeny"?

Despite all these arguments, the matter worth reflecting is if this all is supposedly a "killing of the humans", then is this "killing of the humans" a crime in every condition? If it is a crime in every case, then what will be said of the "killing" when, as a measure of collective needs of the country, thousands of the men are thrown into the battlefield for saving their country by sacrificing their life? For the sake of collective needs, laying down individual's life

(or sending them to the battlefield to sacrifice their life) is a testimony to the stark fact that it is not a crime. It is an action, worth to be elated and applauded. And if this "assassination of the humans" is for safeguarding the truth, then the Qura'n calls it the evidence of the highest order (the martyrdom). If this sending of the living youth to the clutches of death, merely for the collective needs or the safety and security of the truth, is not a crime, then how will deterring the process of coming into being the children who have never been to being be a crime?

Now come to the third objection that says "killing of the children" under the fear of hunger is nugatory to the belief that "Allah is the Nourisher". In other words it means imposing sanctions on the childbirth negates the concept of Allah's nourishment and subsistence. This question warrants a detailed description. The Qura'n says:

> **Slay not your offspring, fearing a fall to poverty. We provide subsistence to them and to you (17: 31; 6: 152)**

At another place says the Qura'n:

> **There is not a living being in the earth but the subsistence thereof dependeth on Allah (11: 6)**

These and so many other similar verses of the Quran are quoted to prove the idea that providing for the subsistence is the responsibility of Allah. Then imposing sanctions on the childbirth with the idea that if population increases, there will be scarce left to eat is against the belief on Allah's responsibility of sustenance. Before reaching the true exposition of these verses, let us see the practical imperatives and implications of the meanings of these verses that are generally accepted.

1. It is a fact that a large segment of the people in the world hardly makes their both ends meet. And whenever there is draught, tens of thousands of the people starve to death. The question is when Allah has undertaken the responsibility of providing for the subsistence to all His creation, then why do such a bulk of people in His creation go empty-bellied to their bed? And why does such a big portion of population starve to death?
2. It will be argued that these people do not strive for their subsistence. But this is a wrong notion. During the draught days, in spite of concerted effort, every one gets nothing. And even in the normal conditions, it so often happens that (just for an example) a labor works for the whole day and gets Rs.150. 00 in the evening. He is a family of one wife and eight children. This many amounts are not sufficient for this family to make both ends meet for a single day. Even the cost of simple flour and vetch is a fired pancake with a layer of pulse in it, so they have to remain famished for a single time.
3. To the face of such a situation, it will be said: 'This is the faulty economic system, which does make no provision for such a family; making-both-ends-meet remuneration ought to be provided minimally as an built-in dispensation'. But look here: now you are no more talking of the Allah's responsibility of providing sustenance to the living being; you are simply conversing of the economic system itself. Is such a situation not nugatory to the conviction of Allah's subsistence? If Allah has undertaken the duty of providing livelihood to each one of the humans, He ought to fulfil this undertaking at every cost.

As a matter of fact, the exposition of these verses of the Quran is that 'the economic system of the country ought to be the one that undertakes the Allah's responsibility on its

shoulders. And satisfies the masses that the provision of their subsistence is the sole responsibility of the State'.

Now go one step ahead. In spite of all the efforts of the State, a situation arises where the production is not compatible to meet the need of the entire population. Nor does the State enjoy the means to import the required sustenance from abroad for the extremely growing population. Then what should the State do? Will it be better in such a situation that the explosion in population is allowed to go unabated –to let the population die of starvation? Or will this be better to impose sanctions on the population explosion so that subsistence be provided to meet their basic needs? The opponents of the Birth Control say the first situation – the explosion in population is allowed to go unabated –to let the population die of starvation –is exactly in accordance with the will of God and harmonizes with the teachings of Islam. And the second situation of imposing sanctions on population to make the means of subsistence correspond to the needs is unlawful as per the Sharia. The State ought to increase its production. There is no doubt, the only iconic configuration – to suit to the best – is to make the production grow in proportion to the population of the country. But we'll reiterate if the production, despite all out efforts and endeavors, does not keep pace with the growing rate of population, then what ought to be done?

Just possible, it may be said: 'If the entire production and population of the world is kept in view, it may be that this much production and that much quantum of the needs of the entire population is at par with each other.' Firstly, it is a conjectured dialogue in its nature and scope; it is not based on facts and figures. On the contrary, the available facts and figures, whatever these are, do not support this conjecturing. Every country of this threatened planet is nearly fraught with anxiety for the growing population and the decreasing strength of production. The entire globe is divided into various nations today, and has their own means to meet their needs. The nations having the surplus do not help others without charging its cost – and how-much-is-to-be-paid-for-it is known to every one. Hence the question related to the total production and population worth to be considered does not arise at this moment. But there is not doubt when the entire populace is knit into universal brother-hood as Qura'n's concept is, and the natural forces of the earth and the sky both are harnessed, the scarcity of subsistence will no longer remain any issue. But at present, the question is: "What is its solution in the existing circumstances?"

----------*----------

Now come to the question at hand. And see: What guidance does the Qura'n provide us for the issue of "Birth Control"? Firstly, make it very clear that the Qura'n has never said anywhere: (i) you go on procreating and (ii) if anyone lacks in this process or discontinues after some time, he/she would be interrogated on the day of judgment. The humans have been endowed with the potential of procreation, but like other synergetic reliazabilities, this will also be used when need arises. Having power at one's command does not mean that it is to be used every time. Anyhow, it will have to be utilized when needed. It is the position of potential and vigor. Its unnecessary use is no more than its abuse, which the Quran has strongly prohibited. Hence the potential of procreation should only be used when the child is needed. Now the question is: "When is the child needed?"

There is no doubt the Qura'n calls the love of spouse and the children as a source of

attraction for the humans. The Qura'n does not teach monastic life. But the Qura'n has never said that the procreation be consistently and persistently continued. And after the birth of one child, the second be immediately initiated to come forth. Birth of the child when needed is the only right use of this potentiality. The same is the exposition of one of the Qura'n's verses where it has been said:

Your women are a tilth for you (to cultivate) so go to your tilth, as you will (2:23).

The meaning intended for the use of the similitude of tilth is: "The women are the means of giving birth to the children". And "as you will," means as the soil is cultivated for tilth, when needed, so will be the procreation –only when needed. For example the Qura'n, for supping and dining, says:

You, when you will, eat freely of that which is therein (2:58).

Obviously it means ' sup and dine' when needed – and never the supping and dining at every time. This witty thought will further be elaborated later on. These illustrations make it clear that the Qura'n has never said anywhere to go on procreating continuously. Nor has the Nature compelled the humans like the animals that they would have to give birth to a child at every cost after some time. To the humans, the children will be given birth when needed. This is called the Family Planning. If the health of the wife is poor, no one can compel you to produce child at every cost. If your earning does not suffice to support more children, you can restrict the birth of the children on your own. These are individual examples. But if there arises a collective need of restricting the number of the children in the country, the process of procreation can be restricted. If for any emergency, arrangement of rationing can be made, if for the scarcity of the animals, meat can be closed for two days in a week, then due to the same emergency, why cannot the sanctions, be imposed on the number of births? And the rationing is nothing except the limiting of the food.

It is said: A person has capital sufficient enough to meet the needs of nourishment of a large number of children, then why should the limitations be imposed on him? But the question is not whether anyone has capital for the nourishment of children. The Question is whether the country has the food appropriate enough to meet the needs of the children. If there is scarcity of food in the country, wherefrom will the wealthy buy the food? Gloss over it: the wealth can not produce food; it can only buy the grown food. So capital money does not solve this problem.

Here we do not mean that the Birth Control must be imposed in the Muslim community. All we mean is that in spite of all out efforts for increasing the production, the existing conditions of the country are such that there is no way out except imposing the restrictions on birth control, the Quran does not forbade it. And nor is this against the teaching of the Quran.

Now we come to the other aspect of the question: "Which means should be adopted for this purpose when sexual urge springs up?" This is a significant thought-provoking question. It is because this question poses a basic point that is perhaps the first one seeking your attention. And is contrary to the routine concept we hold in our life. So its bird's eye view will not serve the purpose.

As a routine matter the nuptial relation is thought to be simply the sexual satisfaction

and nothing else. But according to the dictates of the Qura'n, its basic objective is the establishment of companionship between the husband and the wife. The Qura'n is very explicit when it says:

> **And of His signs is this: He created for you helpmates from yourselves that you might find rest in them, and He ordained love and blessing amongst you. Look; herein indeed are portents for folk who reflect (30:21).**

It means if you look emotionally to it, the nuptial relationship will appear to be the satisfaction of the sex as well as a mean of procreation. But if you understand it from the Qura'n's point of view, it will limelight this fact that it is companionship-oriented. It is based on mutual trust, love, and consolation. The satisfaction of sexual urge and procreation for the race comes much later.

Now look to the sexual urge. Who was he who whispered that sexual urge is a basic need and its satisfaction is a must for the human beings? No body knows. But this enchantment was infused in such a way that the humans assuaged it fully, though the reality is diametrically opposite to it. Thirst and hunger are the basic human instincts. If you are absorbed in the process of deep thinking and feel thirsty, in the beginning you will have no adverse effects on you. But by the passage of time this urge gradually goes on mounting – and if you do not drink water, you'll fall ill – and even if you do not quench your thirst later on, you'll die. The same is the case with the instinct of hunger –though the death occurs comparatively after a longer period. From these examples, you have seen those physical urges, in concurrence to the physical needs, emanate automatically and if these are not satisfied the human falls ill and dies eventually. Now just gloss over this question: ***Is the sexual urge an instinct of the same nature?*** And just keep this vantage point in view in deciding the case: It does never happen that you are absorbed in your work or you are in a trance of thought-process and this urge, on its own, has emerged just like the urge of thirst. Unless you incite this urge, it never comes into the limelight. It does never come into effect until your thought makes it grow.

Compare it with the urge in the animals. You'll find that in the animals, this urge comes to play on its own when their mating season approaches. You just look to the bull. It will continue grazing the entire year with the herd of the cows. Neither will any cow be attentive to it, nor will it be to any cow. When the mating season comes, both the bull and the cow will have sex stimulation. After the cow is pregnant, the bull will no longer be stimulant any more.

But the only difference between the human and the animal is that the human can excite this longing on his own choice. Have you ever glossed over it: Why the nature has orchestrated this difference in the animal and the human? It is because the nature does not want to keep the humans bound for producing the children like the animals' offspring. The animals are bound to reproduce on their seasons. But for the humans, the nature does not want to keep this compulsion. It hands over this option to the humans to galvanize this longing on their own wish and desire whenever they want to produce their children.

But the human, like his other affairs, exercises unfair use of his 'choice and will' in this matter too. In order to meet his needs, the nature has embedded pleasure with its satisfaction. For example, food brings nourishment to the physical body, but the nature has brought taste with it, a source of pleasure now. Do you know what did the human being do with it? He kept the accomplishment of his need in tact as if it is a mere compulsion and has continuously

harped on its taste and pleasure as if it is the entity worth to be enjoyed maximally. Now we have reached the stage where the aspect of meeting the "basic needs" has been restricted to the tune of 1% and the rest of 99% is reserved for seeking pleasure and taste in our wealthy families. Seeking of pleasure is not bad provided this pleasure is a mean towards the accomplishment of the need, and not an end in itself. With the unfair exercise of his choice, he has preferred the accomplishment of taste of the edibles. He did the same with the sex potential. This potential was given for procreation, to which the Nature also attached the aspect of pleasure. But he made the sexual pleasure as the end to be achieved through it. Now he has left the need and has made the sexual pleasure as the only end in his life. You would have heard of the people who eat the most delicious food to their belly full and then by inserting their finger into their mouth they vomit it all and then star eating again. Setting the basic needs aside and enjoying pleasure with sexual orgasm as the only end has made man too wayward to be restricted. He remains engrossed with this orgasm.

The aforementioned illustration makes it clear that the purpose of sex potential is reproduction. The other ends such as making use of it for the sake of pleasure and enjoyment is against the aim of the Nature. The Quran has used two terms for determining whether the use of sex potential is fair or foul, legal or illegal. And this makes the matter quite clear. The Quran has given a list of relations with whom the wedlock is Haram, illegal. Then the Quran says the marriage with other women is Halal, legal for you but the condition is that the sexual relation with them is based on ***muhse neena ghaira musaa feheena (4: 24)***.

Muhse neena means "to keep safe and snug; to fortify against any oddity; to keep guarded and protected". And **musaa feheena** means, "to have sexual intercourse only for ejaculation of semen for getting orgasm". The only difference between wedlock and fornication is that in wedlock, the purpose of sexual intercourse is to keep semen secure in womb for reproduction, and in fornication it is tried to seek pleasure without getting the semen fertilize the female ovum in the womb. It is simply the ejaculation of semen for orgasm. So the first and the foremost exposition of these two terms of the Quran is 'wedlock and fornication'. With this exposition the Quran has explicitly made the purpose of sexual intercourse very clear. It means:

1. If the sexual intercourse is committed without wedlock, it is out and out illegal. Its purpose is not reproduction; it is simply the pleasure seeking.
2. The purpose of sexual intercourse under wedlock is the reproduction. Without this purpose, the sexual intercourse is for pleasure seeking. Then this is the wrong use of the God-given potential. In such a case the wife remains no longer any harvesting. She becomes simply an entity of luxury and voluptuary.
3. The legal use of this potential is for reproduction; the wife is a harvesting, and not a mean of pleasure seeking. If it galvanizes pleasure alone, then it is the waste of this sexual potency.

This solves the entire issue of Birth Control. Prior to it, we have made it clear that:

a. The reproduction should be initiated when needed. It was on this count, that 'the choice and will' was given to the humans. And now we have also seen that:

b. The sexual intercourse with non-married woman is Haram, illegal and that:

c. The sexual intercourse with one's own wife, duly brought under the covenant of marriage, is fair, legal only when it is committed in harmony with the aim of Nature. In other words it means that it is done for reproduction. And when reproduction – producing children – is not the end in itself, then the question of having sexual intercourse with one's own wife does not arise.

It is due to this reason that the teaching of the Quran makes no room for applying any contraceptives – medicines and/or mechanisms – for family planning. And nor is there any need of making male, the husband, and female, the wife infertile. With these teachings the husband and the wife both self-impose limitations, avoid sexual intercourse and goes on avoiding till they feel the need of reproducing a child. There is neither any need of a'zel, nor of any contraceptives, for which it is feared that these contraceptives enhance the danger of fornication /adultery many-fold.

Just possible you may argue: "How is it possible that the husband may not go to her wife when she is hale and hearty, - healthy and lively?" How is it possible? This was the point, that we made clear to our readers when we said: This would perhaps come to you for the first time; maybe it look to you unique and wondrous; so do not superfluously reach any conclusion. Think deeply and then reach any judgement.

This is not impossible. It is possible. And is possible to such an extent that you need no conspicuous vacillation, wavering or hesitation for it. You have seen that the sexual longing in humans arises when they have a thought of it. It does not arise on its own. Thoughts of the human, his education and training, his ideas and beliefs are closely knit with this longing. You just ponder over this fact that, when your wife is in menstruation period, any idea of having sexual intercourse with her does never come up to your mind, not even in recesses of your heart and mind. But a non-Muslim does never feel any hesitation for sex satisfaction during this period. Why? It is because your belief is that during this period the intercourse is not legal. Even the idea within your vision for intercourse does not come to pass by it. Or take another example, an evil-doer youth, who does not feel any hesitation in assaulting the unfamiliar women sexually, remains fast asleep near his own adolescent, young sister, when there is none else except these two. He does never think of having his sex satisfied with her. It all is nothing but a marveling of his ideas and convictions. No doubt, there are some exceptions to it. There are some persons who do commit intercourse with their sisters and daughters. But these unusual occurrences are absolutely the works of the psycho-neurotics, the psychopaths. The normal men do not come under this category.

The following example will make the point under discussion clear:

Some years back there appeared a strange life-story of an American pair in the newspapers. This pair was living as husband and wife from the last eight or ten years since the appearing of their life-story in the papers. They were hale and hearty, enjoying gay and glee. They had extremely beautiful children – two or three – during this period. One fine morning they came to know that they were brother and sister. It so happened that when they were still children, their parents were killed in England. A military man took the boy away and an American took the girl. These, the brother and the sister, were quite unaware of this happening. The brother did not know that he had any sister. And the sister did not know that she had any brother. It was just an accident that after the battle the boy went to USA where he met that girl,

who had grown up to be young by then. Both got married. They could not know of any thing of their previous relation with each other for many years – None of the two knew any incidence of their childhood.

One day they came to know that they were real sister and brother. It was after 8 or 10 years. What a ravishment they were encountered with can be judged from the statements they made to the print media. How many days they spent in wailing, weeping, howling and ululating! They did not know what to do. Anyhow, the priests consoled them. And they again started living the life of a real brother and sister.

What was this? It was only the impact of the concept that a brother and a sister cannot be husband and wife to each other – though during the days gone-by, the ancient emperors of Iran, the Sasanian kings, used to get married with their real sisters. It is only the impact and influence of the thoughts and the concepts that makes it possible.

Hence, if we inculcate this idea and concept as an integral part of our belief that the sexual intercourse with wife can be only for reproduction, we'll never get the notion of intercourse deep-rooted for other than this pursuit. And we'll hell with this concept of sexual intercourse as we do during the menstruation period of the wife.

About 25 years back, the people especially in the rural life, used to hold the concept that there should be no sexual intercourse with the wife till the child is being suckled. The people used to stick to it so intensely, that the one who violated it had to hide his face from the people. The purpose of these illustrations is to make this point clear that the sexual longing remains under the influence of the human thought, so its control is no more difficult. That is why the Quran does not acknowledge any "involuntary state" for the sexual longing. The "involuntary state" means, a state of compulsion in which the humans become helpless all together. There is no doubt the Quran accepts "hunger" as an "involuntary state". That is why it allows to eat even whatever is Haram, illegal if the urge of hunger overpowers. But for the satisfaction of sexual longing, it has never allowed anywhere that it should be satisfied. On the contrary it (the Quran) has made it very clear that

> **And the people who can not find a match, (should exercise self-restraint to) keep chaste (24:33).**

It means, like those who are allowed to eat Haram, illegal in "involuntary state", no one is allowed to cohabit illegally when there are no legal means available for satisfying the sexual longing.

This was the Quran's concept of sexual longing. Think how elevated the Quran wanted us to be. But when we left the teachings of the Quran how mean of the means we turned out to be in our mentality for the satisfaction of sexual longing. Pause and reflect over what was the state of the kings of the nations. They had two to three thousands young concubines in their palaces. The women in the bazaars of those nations were auctioned like the animals. It was all done in the governance of those who argue for justifying the need of four wives on the plea that this process of having so many concubines develops a program through which not a single night goes, without satisfying the sexual urge. There is no need of any more talk about their concept of sex. How much we, as nation, are duped in sexuality, just take any book of ***Tibb-i-Unani***; even consult any list of ***Tibb-i-Unani*** medicines and see how many of the medicines fall under the category of sex. It is the result of this mentality that we have *Fatwa* in

its favour. Take one as an example that is given in favour of satisfying the sex urge. “Suppose a young boy and a girl reach an island where there is no human population. They can have “temporary wedlock” till their coming back to the population.” It means we cannot imagine even that a young pair can live without sexual intercourse for a few days. This is the state of the nation whose Divine Book, the Quran, does not acknowledge “involuntary state of sex”. It is because this Book keeps the sex at a place where the Nature has placed it. We misplaced it. Then came the thundering tumult of the Western civilization and ignited the state of sex all the more. It is the thunder that has engulfed our present generation.

Its remedy lies in:

1. Bringing change in their concepts of sex
2. Adopting sound strategies for checking the western thought

The true and genuine Islamic Education for our children is necessary for this purpose.

----------*----------

The summery of what has been said in the previous pages is:

1. The question of Birth Control is gaining momentum. It is because the rate of production of our country cannot meet the needs of population explosion.
2. There are two parts for the solution of this difficult issue:
   (a) Arrangements be made to increase maximally the production of the country
   (b) Even if this production is not sufficient enough to meet the needs, sanctions be imposed on reproduction.
3. So far (1) is concerned, it is necessary that
   (a) The land is managed in tone and tenor of the teachings of the Quran.
   (b) The distribution of the subsistence to the needs of the individuals is made the sole responsibility of the State.
4. So far (2) is concerned, the Quran does not raise any objection to impose restrictions on reproduction for meeting the collective and emergent needs. The Nature has subordinated the reproduction potential to the sweet will of the humans so that they may have control over reproduction. And they may not be helpless and constrained like the animals in this matter.
5. But the right method of Birth Control is self-control.
6. This kind of self-control is not as difficult as it is thought of. The sexual longing is sub-ordinate to the human thinking. If the thought process does not divert to it, this longing does never rise.
7. For this purpose, it is necessary that
   (a) The Quran’s concept of sex is popularized among the masses
   (b) The woman is given the status of honor and prestige in the society. Instead of being a tool for the sex gratification of man, she may be thought of as the main spring of training the nation and the humanity. She too may be considered a free, independent and rational being. Her aim in life should not be to make herself a source of temptation

to men but to impart meaningful partnership.

(c) All the means, leading towards sex stimulation are stopped forth with. The Quran condemns lewdness, indecency, pornography and all things that excite and ponder to the sex passion. These stimulants include sexy films, pictures, literature, art, nudeness, wrong dress of the womenfolk etc

(d) The System of Education is made Islamic, reflecting the teaching of the Quran.

In this way, not only will the issue of Birth Control be solved, but also the energies of the nation that go waste in seeking sexual orgasm are preserved to the extent that every constructive program will be launched and accomplished in the best possible way. This is the reality of the Quran. Some modern writers, after an extensive study of the sex life of primitive as well as civilised men, have come to the conclusion that chastity is essential to the progress of humanity. Dr. J. D. Unwin of Cambridge University, has studied the sex life of some eighty primitive tribes and of sixteen civilised nations. He has set forth his views in his book "Sex and Culture." He writes in this book:

> ***No society can display productive social energy unless a new generation inherits a social system under which sexual opportunity is reduced to a minimum. If such a system be preserved, a richer and yet richer tradition will be created, refined by human entropy.*** **(p. 414)**
>
> Dr. Unwin writes in the last:
>
> **If, . . . , a vigorous society wishes to display its productive energy for a long time, and even for ever, it must re-create itself, I think, first, by placing the sexes on a level of complete legal equality, and then by altering its economic and social organization in such a way as to render it both possible and tolerable for sexual opportunity to remain at a minimum for an extended period, and even for ever. In such a case the face of the society would be set in the Direction of the Cultural Process; its inherited tradition would be continually enriched; it would achieve a higher culture than has yet been attained; by the action of human entropy its tradition would be augmented and refined in a manner which surpasses our present understanding. (p. 432)**
>
> *(Unwin, J. D. : SEX AND CULTURE, Oxford University Press, London, 1934.)*

We have seen that

1. The Nature has attached a safety valve over the sexual urge in the animals. It stimulates this urge at the time of reproduction. It means the animals cannot execute family planning on their own. They have no choice for this purpose. Its benefit is that such a precious vitality does not go waste in them. It is because they have no command over sex gratification for pleasure seeking.
2. The Nature has given choice to the humans for family planning. It means they are not as bound as the animals are during their mating season. Only the humans have the option to reproduce according to their planning. It was the greatest blessing of the Nature endowed on the humans.
3. But what does the human do? He does not opt for Family Planning. To this extent he keeps himself at par with the animals. In other words it means that the animals cannot make

Family Planning; the human can do, but he doesn't do it. The result is the same for the animals and the humans both. And moreover, he wastes the so precious vitality in him only for enjoying the sex. So he lives a life more low than that of the animals'. As they can not make Family Planning, so they do restore their vitality. But this human, by exercising his wrong option, undergoes double loss: (a) he looses energy, the vitality for procreation, and (b) he lives life of a lower level and becomes lower than the animals. That is why the Quran says to the humans: **"These are as the cattle – nay, but they are worse!" (7: 179).** At another place, the Quran says: **"Surely We have created man of the best stature. But (what so ever he does, its result is that) We reduce him to the lowest of the low." (95:4-5)**

Is it not the lowest of the low that he makes use of the possible potential of family planning – endowed to him – but, by the wrong use of his option, wastes his energy – vitality, - and remains at loss as compared to the animals? That is why how effectively the Quran describes the human status: The history of the time stands witness to the stark fact that **the human has done a great loss to himself. (103: 1-2).**

Have you ever thought of its reasons? Family Planning relates to the human reason and sex gratification to the passions, to the emotions. Whenever the human makes his reason subordinate to his emotions, he undergoes a loss. And whenever he makes his emotions work under the command of his reason, he clinches success. The teaching of the Quran was to make the emotions work under the human reason. It is usually said that all the human problems lie under three categories: wealth, land, and woman. The human had always made the emotions outweigh the reason in all these three areas of the problem – but more true is that he has made his pleasure overpower his need. Consequently it has brought and is still in the process of bringing chaos and anarchy in the society. The Quran solved these three problems -the most difficult and the most significant -in one sentence for each of these three problems. It said: Wealth (Capital) is a facilitating mean of bartering things. It should be used for this purpose. Hoarding wealth for the purpose of sheer greed is the most wrong use of it. The Quran said the true economic system is the one that does not permit anyone to keep the surplus money with oneself. With this principle, the Quran cured the wealth-created ills of anarchy and disorder. In other words it means the Quran adjudged wealth a thing of necessity. It had never permitted the wealth to become the mean of satisfaction of the emotions.

For the land, the Quran proclaimed that it is a mean of yielding subsistence for the humans, so it must be kept open to meet the needs of the needy. It means the Quran adjudged the land, too, to be used for meeting the needs and had never permitted it to be used for the satisfaction of the emotions.

Similarly the Quran said of the woman that the sexual intercourse with her is only for the purpose of reproduction – not for the gratification of emotions. In this case the Quran also made the emotions subservient to the need. And hence solved this difficult problem.

The human is gradually nearing to the Quran's concept of wealth and land. But he has yet not realized the need of any change for his views about the woman. And hence this problem is turning to be a source of trouble for him. The day he realized that he has been given the option of choice and will over the sexual urge for keeping control over reproduction and that the aim of sexual intercourse is the reproduction, not the sex gratification, will be a

revolutionary day in the world. Let us see who is the first noble Muslim nation that clinches this blessing.

But it is evident that the accomplishment of this program will take sometime. We'll have to develop our coming generation on the foundations of education and training the Quran enshrines. But this work cannot be done in a single day. So if the exigency of our circumstances demand the adoption of preventive measures to exercise control over the growing population, then the compulsory preventive measures, that are not harmful for health, can be adopted. But it must be seen that these devices may never reach the hands of those who may make their unfair use. Come what may, fornication is strictly prohibited in Islam. Respect abiding persons of Islam can not make use of these devices for fornication. But this will be the device used as emergence measures. For permanence, only those devices will be adopted that conform to the sweet will of the Nature – which have been detailed earlier, i.e. Sexual intercourse will be committed only when reproduction is the need. But this will come through the genuine education and proper teaching, as the Quran desires.

****

SUMMARY

Since this topic is both difficult and technical, perhaps some facts have been presented for the first time, so it looks necessary that these be brought to mind briefly:

1. The humans, like the animals, have the potential of reproduction. And for this purpose, the sexual urge like that of hunger and thirst does not stimulate on its own. It is also not that of the nature if you do not gratify it, you are liable to fall ill and die after some time. The sexual urge stimulates under the influence of human thought and reason. So it is an entity of the human's own choice and control to be stimulated.
2. In case of animals, the Nature has kept its control within itself. The animals can not make this urge stimulate on their own. When the Nature wants the reproduction, it lets this urge stimulate. And when this aim is achieved (i. e. pregnancy occurs), this urge subsides on its own. It makes it clear that Family Planning is beyond the scope of the animal kingdom. Without mating season, they can not reproduce, nor can they reproduce after the mating period is over. Their Family Planning is in the control of the Nature.
3. But the humans have been given the option of choice and will so that they may reproduce according to their program. There is no compulsion on them in this regard. So Family Planning for the humans is in tone and tenor with the will of the Nature in the sense that the Nature wills the humans reproduce according to the set planning of their own.
4. The Family Planning can be done for meeting the individual as well as collective needs. The Quran has projected wife with the simile of crop and has made it clear that sexual intercourse with her is only for reproduction, and never for pleasure seeking. The Quran said cultivate your crop as your program is. The Quran has also made it clear that there is no compulsion on you for reproduction; reproduce whenever you desire. In other words when you want reproduction, then go to your wife sexually. And when you do not want, never cohabit.
5. But the humans neglected the purpose of cohabitation and indulged in pleasure seeking. This made the doors of fornication wide open. Now this fornication is the main cause of

crime and devastation in the world.

6. Its cure lies in appropriate education and training. This should be instilled in the mind of the humans that sexual intercourse is only for reproduction. Sexual intercourse for pleasure seeking is against the will of the Nature. When the humans make it an integral part of their belief, there will be no need of imposing any control over sexual intercourse. There will also be no need of any Family Planning then.
7. But time is required for making this concept grow to the level of maturity in the heart of the human. If the circumstances so arise where Family Planning becomes necessary then medically preventive measures can be adopted. But the following two things will have to be maintained:
   (a) That these measures are taken under emergency conditions. Genuine and real method of Family Planning is through self-control.
   (b) That strict measures of surveillance are imposed so that the illegal use of these contraceptives does not make fornication easy. Moreover, Islamic regulations regarding fornication be widely publicized and implemented rigorously.
8. The objections of the religionists for Family Planning are neither founded on the teachings of the Quran, nor have any weight in the arguments they put forth. It must be made clear that Family Planning is one thing and measures for Family Planning is another thing.
9. The religionists have the following objections on Family Planning:
   (a) This is "progeny killing". This argument carries no weight. It is because without fertilizing the female ovum, there is no living being in the womb. The question is if letting the sperms go waste is the killing of a person, then tens of thousands of these sperms go waste, because after pregnancy, none of these sperms have the possibility of fertilizing the female ovum. Is this also the killing of the humans? If yes, then no one can be saved from the crime of "killing of the persons."
   (b) It uproots the belief in Allah's responsibility of providing the subsistence to the living beings. If the concept of Allah's subsistence is that Allah directly provides subsistence to every human child, then our routine observation is negated. We see tens of thousands of children starve to death and millions of them do not get nourished due to deficient food. The Allah's covenant of providing subsistence gets regulated in the true System of the Quran. If, at any time, this System finds that the nourishment of the growth of such a number of children is not possible, this System can restrict the number of children in the family. It will be quite unfair that we may go on increasing the number of children as we like making the society responsible for their nourishment. If we have to hold the society responsible for their nourishment, the society ought to decide as to how many children it can arrange for their nourishment. In this way the decision of making Family Planning as per the collective expediency would be the entire responsibility of the society. Anyhow, the genuine mechanism of birth control – Family Planning – will be the self- control of the incumbents. But till it is possible, the mechanisms on emergency basis can be adopted provided they are not used for illegal purposes. Foolproof arrangements are to be made for checking their unfair use.

Now the work to be done would be:

1. Make arrangements for increasing the agriculture produce of the country. One of the most important devices for it would be the infusion of perfect assurance to the working class that no body would snatch the earnings of their hard labour. And that the land, from God, is the mean of subsistence for the humans; it is not a mean of luxury for a few selected individuals.
2. All the means that cause the sexual stimulation are stopped forth with. And means of fornication are locked up.
3. The concept of self-control is publicized among the masses. And if medical devices for Birth Control become necessary, strict arrangements be made in such a way that they may not be used for illegal purposes – illegal purposes mean fornication that is absolutely Haram in Islam.

This, in a nutshell, is the concept of Family Planning, the objections this concept is fraught with, the measures that are to be adopted, and the basic changes that are to be imbibed in the heart and mind of the masses.

****